بسم اللہ الرحمن الرحیم

تحریک ادب

شمارہ(99)مارچ-2026 جلد نمبر 19

Tahreek-e-adab vol-19, issue-99 March 2026

Editor مدیر

جاوید انور (ڈاکٹر جاوید احمد) **Jawed Anwar** (Dr.Jawed Ahmad)

cell-0091-9935957330

مجلس ادارت

Editorial board and Peer Review committee

پروفیسر صغیر افراہیم،سابق صدر شعبہء اردو،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.

پروفیسر شہاب عنایت ملک،سابق صدر شعبہء اردو،جموں یونیورسٹی

Prof.Shohab Inayat Malik HOD Urdu,Jammu University

ڈاکٹر شمس کمال انجم،صدر شعبہء عربی،بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی

Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)

پروفیسر محفوظہ جان،سابق صدر،شعبہء کشمیری،کشمیر یونیورسٹی

Prof. Mahfooza Jaan(Ex.H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)

پروفیسر شاہینہ رضوی(سابق صدر،شعبہء اردو،مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ یونیورسٹی،وارانسی)

Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)

ڈاکٹر دبیر احمد،صدر شعبہء اردو،مولانا آزاد پی۔جی۔کالج،کولکاتا

Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata

ڈاکٹر احسان حسن،شعبہء اردو،بنارس ہندو یونیورسٹی

Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

نجمہ عثمان،،اشتیاق احمد،عرفان عارف،ڈاکٹر چمن لال

Najma Usman (Surrey, United Kingdom)

Ishtiyaq Ahmad (General Secretary, Sir syed society Varanasi)

Irfan Arif (H.O.D.Dept. of Urdu,GDC Reasi University of Jammu,

Dr. Mohd. Qasim Ansari (Asst. Prof. Drpt. of Urdu Banaras Hindu University, Varanasi)

Dr.Chaman Lal Bhagat (Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

سال اشاعت: Year of Publication 2026 Vol-19(جلد نمبر19)

شمارہ نمبر شمارہ 99۔مارچ ،2026 Issue-99 March

سرنامہ خطاط:انور جمال Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi

سرورق : عظمیٰ اسکرین Title cover Uzma Screen, Varanasi

فی شمارہ : دوسو روپئے 200/-Two Hundred rs. per copy

زرسالانہ : دوہزار روپئے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپئے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زر رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:
Jawed Ahmad IFSC SBIN0016812 A/C no. 33803738087
State Bank Of India, Branch- Lahartara
Varanasi-221103(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارنسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔
Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے نیہا پرنٹنگ پریس، وارانسی سے شائع کرار دو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔
Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from Neha Printing Press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

1۔غزلیں	رفیق راز	6
2۔نظمیں	عمر فاروق، پرویز مظفر	7
3۔غزلیں	سہیل اقبال، ذوالفقار نقوی، ڈاکٹر بختیار نواز	9

مضامین:

1۔2025 کا فکشن اور فکشن تنقید: ایک جائزہ	پروفیسر اسلم جمشید پوری	12
2۔مصحف اقبال توصیفی: منجمد پر شور دریا	اسلم عمادی	46
3۔برق کلیسا۔اکبرالہ آبادی: ایک تجزیاتی مطالعہ	پروفیسر شاہینہ رضوی	52
4۔مخصوص ضروریات کے حامل افراد کی تعلیم کا سفر (آزادی سے نئی قومی پالسی 2020 تک بنیادی قوانین اور پالسیاں)	ڈاکٹر ندا شہاب، ڈاکٹر عمران انصاری	61
5۔اقبال اور گوئٹے	ڈاکٹر نعیم رضا	77
6۔محمد حفیظ: مقبول افسانہ نگار	ڈاکٹر پروین خانم	81
7۔ماہنامہ عالمی زبان (لولاک نمبر) ایک معروضی مطالعہ	ڈاکٹر سید ہمایوں اختر	88
8۔اردو زبان کی اہمیت	ڈاکٹر افروز جہاں	92
9۔ڈاکٹر محمد حسن: اردو افسانے کا ایک معتبر نام	ڈاکٹر اصغر علی	95
10۔پرویز شاہدی کی نظم "تثلیث حیات" ایک جائزہ	عیسیٰ اسلم	100

11۔چیٹ جی پی ٹی اور اردو زبان کا اکتساب یوسف شکیل 107
12۔بنسی نردوش اور کشمیری ناول رئیس احمد 121
13۔جوش کے گیتوں میں تصویری جمالیات محمد طیب جمشید پوری 126
14۔قومی تعلیمی پالسی 2020 کے تناظر میں:
تعلیم میں کمیونٹی اشتراک محمد شبیر، پروفیسر اشونی 132
15۔ترنم ریاض کا ناولٹ
"مرارخت سفر آنسو" ایک جائزہ مبشرہ لئیق 139
16۔اسلام، قانون ہند اور اسکول: ایک ہمہ جہت
تجزیاتی مطالعہ (اسلامی تعلیمی تصورات اور بھارتی دستور
کے تناظر میں ایک علمی و تحقیقی دستاویز) حافظ محمد انوار مصطفیٰ 148
17۔مولانا عبدالماجد دریابادی: اردو ادب اور انشا پردازی
کا ایک منفرد دبستان (ایک جامع تحقیقی و تنقیدی مطالعہ) حافظ محمد انوار مصطفیٰ 154
18۔حکیم الامت علامہ اقبال: فکر و فن کا ایک ہمہ گیر مطالعہ
(اردو شاعری اور اسلامی فکر کے تناظر میں ایک تحقیقی مقالہ) حافظ محمد انوار مصطفیٰ 158

غزلیں Ghazlein

Rafiq Raaz (Srinagar) 7889968878
رفیق راز (سرینگر)

ہے بظاہر تو بس اک آئینہ بردار یہ دشت
لیکن اندر سے ہے گنجینۂ اسرار یہ دشت

ہم عزاداروں کی تثلیث بھلا اور ہے کیا
مختصر قافلہ یہ قافلہ سالار یہ دشت

دیکھ یہ رات یہ خیمہ یہ سیہ پوش چراغ
دیکھ یہ حوصلہ یہ صبح کے آثار یہ دشت

اس جگہ کس نے لٹایا ہے خزانہ اپنا
ہو گیا تین ہی دن میں بڑا زردار یہ دشت

ہونے والا ہے بس اب آخری سجدہ بھی ادا
ہونے والا ہے ابھی بس گل و گلزار یہ دشت

تھی مشیت یہ خدا کی کہ گرے سجدے میں
ورنہ رکھ دیتے الٹ کے شہہ ابرار یہ دشت

عصر تک اس نے سنی نیزہ و خنجر کی صدا
اب سنے گا کئی زنجیروں کی جھنکار یہ دشت

دیکھ نیزے پہ یہ سورج کا سفر شام کا دیکھ
دیکھ یہ آہنی زنجیر یہ بیمار یہ دشت

شکر ہے ابن علی آئے مسیحا بن کر
اپنے اندر تھا لئے کتنے ہی آزار یہ دشت

(2)

یوں دشت معانی میں ہوا نغمہ سرا میں
جس نے بھی سنا مجھکو اسی پر نہ کھلا میں

اونچائیوں کو روح کی چھونے چلا تھا میں
اندر ہی کہیں جسم کی سرحد پہ گرا میں

آہنگ ہوں دریائے خموشی کا یہ کیسا
دنیا ہمہ تن گوش ہے بے صوت و صدا میں

تنہائی سے کیوں خوف اب آتا نہیں مجھ کو
کیا ساتھ مرا چھوڑ گیا ہے یہ مرا میں

معنی ہوں کسی پھول کی خوشبو تو نہیں ہوں
آزاد ادق حرف سے ہونے سے رہا میں

حالانکہ سیاہی کے سمندر تھے میسر
پھر بھی نہ کسی طور قلم بند ہوا میں

تشریح کبھی ہو نہ سکی اس سے بھی میری
دیمک زدہ اوراق پہ لکھا ہی رہا میں

دھیرے سے چلی ہجر کی زہریلی ہوا یوں
اک رنگ کی صورت ترے منظر سے اڑا میں

لینے نہ دیا دم بھی کہیں شوق سفر نے
منزل سے بہت آگے کئی بار گیا میں

نظمیں Nazmein

Omar Farooq

عمر فاروق

خاک وطن Khak-e-Watan

ثبوت چاہئے اس کو مرے حوالوں کا
کہ میری خاک وطن میں کہاں سے آئی ہے
یہ میرے جسم کی مٹی میں خون کس کا ہے
یہ میری روح میں شامل سکون کس کا ہے
یہ میری آنکھ میں جو خواب ہیں وہ کس کے ہیں
شعور بزم کے آداب ہیں وہ کس کے ہیں
مسافتوں میں حجاب و سراب کس کے ہیں
اندھیری شب میں مرے ماہتاب کس کے ہیں
وہ اور تھے کہ جو ہجرت میں سب کو چھوڑ گئے
وہ اور تھے کہ جو رشتہ زمیں سے توڑ گئے
اسی زمین پہ اجداد میرے دفن ہوئے
اسی زمین کی مٹی میں میں بھی جاؤں گا
یہ سارے لوگ مرے ساتھ اک گواہی پر
فریب کھانے سے پہلے ہی سر کٹا لیں گے
یہ سارے لوگ تری دسترس میں آ کر بھی
بدن کو چھوڑ کر روحوں کو خود اٹھا لیں گے

مکالمہ Mukalema

عقل کہتی ہے کہ ہر در پہ تری خاک ملے
دل یہ کہتا ہے کہ سجدوں میں کوئی بات تو ہو
عقل کہتی ہے کہ اب دشت تمنا ہی سہی
دل یہ کہتا ہے کہ کب تک یہ تمنا یہ جنوں
عقل کہتی ہے کہ اب دست دعا اور اٹھیں
دل یہ کہتا ہے کہ غم ہے تو غنیمت ہے جہاں
عقل کہتی ہے ترے نام سے نسبت نہ سہی
دل یہ کہتا ہے کہ نسبت جو نہیں کچھ بھی نہیں
عقل کہتی ہے کہ اب دور جنوں ختم ہوا
دل یہ کہتا ہے خرد میں بھی تماشہ ہے وہی
عقل کہتی ہے مسافت کا سفر جاری رکھ
دل یہ کہتا ہے ٹھہر دور کے جانے والے
عقل کہتی ہے کہ اب ہم بھی نہیں تم بھی نہیں
دل یہ کہتا ہے کہ بس ہم ہی نہیں ہم ہی نہیں
عقل کہتی ہے کہ زنداں سے کہیں اور چلیں
دل یہ کہتا ہے کہ اب دار و رسن دور نہیں

Parvez Muzaffar (Birmingham, U.K)

cell-0044-7814783097

پرویز مظفر (برمنگھم، یو۔کے)

Nazm نظم

دھوپ ہے
کھڑکی کھولیں
ہوا کو اندر آنے دیں
آندھی اندر غراتی ہے
جانے دیں جانے دیں
خود سے پوچھ رہے ہیں
کیا جانے دیں
ٹھاٹھے مارتا سمندر
آنکھ کی پتلی
بہہ جانے دینا
غم سے لپٹے رہنا
ٹھیک نہیں
تہہ خانے کی سیلن کو جانے دیں
دھوپ کو اندر آنے دیں

Andhera اندھیرا

زندگی کے میلے میں
جس میں
بہت جھمیلے ہیں
اس نے ایسے ایسے کھیل کھیلے ہیں
کہ بس
جان پر جان کو لاد کر
ادھر سے ادھر بھاگ کر
تھک ہار کر
ایسے بیٹھے ہم
کہ بس
اب اور نہیں سہنا
اس دریا میں نہیں بہنا
حالانکہ آگے پیچھے
بہت سے غم ہیں
اور ہم
کہہ رہے ہیں
ہم کو اجالا چاہئے

غزلیں Ghazlein

Suhail Iqbal (KSA)

whatsapp no.00966-5547-11667

سہیل اقبال (سعودی عرب)

یہ کیا ستم ہے کہ اکثر نظر نہیں آتا
بچھڑنے والا بچھڑ کر نظر نہیں آتا
وہ کھا کے ٹھوکریں مجھ سے شکایتیں نہ کرے
کہ جس کو راہ کا پتھر نظر نہیں آتا
اسی کے ہاتھ سے یہ زندگی ہوئی زخمی
کہ جس کے ہاتھ میں خنجر نظر نہیں آتا
یہ زخم بھرتے ہوئے اب سوال کرنے لگے
بہت دنوں سے ستم گر نظر نہیں آتا
زبان جس نے ہوا کے خلاف کھولی تھی
وہی پرندہ شجر پر نظر نہیں آتا
تم اپنی آنکھوں سے جب بھی کلام کرتے ہو
تمہارے جیسا سخنور نظر نہیں آتا
ہمارے گھر سے سمندر تو ہے قریب مگر
ہمارے گھر سے سمندر نظر نہیں آتا
بلند و بالا مکاں ہیں پڑوسیوں کے سہیل
اسی لئے تو مرا گھر نظر نہیں آتا

(2)

نکل کے گھر سے جو بار سفر اٹھایا ہے
قدم یہ میں نے بہت سوچ کر اٹھایا ہے
جو اپنے وقت پر انجام تک نہیں پہنچی
اسی پرانی محبت نے سر اٹھایا ہے
خموش رہنے کا اب تو کوئی جواز نہیں
سوال تو نے مری ذات پر اٹھایا ہے
وہ جس مقام کو دارالامان کہتے ہیں
اسی مقام پہ تتلی نے سر اٹھایا ہے
ہمیں تو کار مشقت ہے سانس لینا بھی
یہ بوجھ وہ ہے جسے عمر بھر اٹھایا ہے

(3)

اگر چہ دیکھنے میں کم بہت ہیں
مگر ہم ایک ہوں تو ہم بہت ہیں
الگ ہی بات تیرے لمس کی ہے
وگرنہ زخم کے مرہم بہت ہیں
کسی سے سن لیا میں خوش بہت ہوں
وہ سن کے یہ خبر برہم بہت ہیں
گلہ ہوتا نہ گر ہوتے برابر
مگر خوشیاں ہیں کم اور غم بہت ہیں
نہیں ان کا اداکاری میں ثانی
لیے پھرتے جو آنکھیں نم بہت ہیں

Zulfiqar Naqvi (Mendhar,Poonch)

cell-9419250361

ذوالفقار نقوی (مینڈھر، پونچھ)

میں پھر کوئی غزل لکھوں مجھے اچھا نہیں لگتا
یہ لفظوں کا تماشہ ہے جو اب سچا نہیں لگتا
کیا میں نے تعاقب عمر ساری بس سرابوں کا
اب اپنے دست و پا پر بھی مرا قبضہ نہیں لگتا
یہ جس میزان پر تلنے کو سودا میرا رکھا ہے
منافع کا کوئی امکاں نظر آتا نہیں لگتا
انا کا ان کی سر اونچا، کہ یہ ہے کجروی میری
کسی دن اس معمہ کا بھی حل ہوگا نہیں لگتا
عنادل اپنے ارمانوں میں بھر لیں عزم کا سودا
تو کوئی گل کوئی بوٹا کبھی اونچا نہیں لگتا
سر بازار اب انسانیت کا قتل ہوتا ہے
ہمارے شہر میں اس موت پر فتویٰ نہیں لگتا
مصر ہے اب بھی تو اپنی روش پر حیف اے نقوی
زبوں حالی میں تیری کیا ترا حصہ نہیں لگتا

(2)

معین میں حد پرواز اپنی کر نہیں سکتا
کہ اس بادمخالف سے کبھی میں ڈر نہیں سکتا
عجب انداز سے کی ہے مرے محسن نے گل باری
لگا ہے دل پہ کاری زخم جو، وہ بھر نہیں سکتا
شرر ہے خون میں میرے ثبات عزم کا ایسا
جبین ناز کو چوکھٹ پہ تیری دھر نہیں سکتا
ہزاروں آندھیاں اٹھیں کہ سر پہ بجلیاں چمکیں
اجل سے پیش تر خوف اجل سے مر نہیں سکتا
اسیر آشیاں رہتا نہیں شاہین اے نقوی
خلاف اوج و رفعت کام کوئی کر نہیں سکتا

(3)

میری متاع فکر جو پر تولنے لگی
افلاک پر نجوم سے سر جوڑنے لگی
حقانیت کے در پہ ہوئی سجدہ ریز جب
اسرار آگہی کے یہ در کھولنے لگی
خاموش زمزمے جو تھے سارے جہان کے
میری زبان دار پر بھی بولنے لگی
یکسر زمام زندگی ہاتھوں سے چھٹ گئی
دوش ہوا پہ آرزو جب دوڑنے لگی
فکر شعور ہالہ ظلمت کو توڑ کر
سنگِ شعاع حسن سے سر پھوڑنے لگی

Dr. Bakhteyar Nawaz (Varanasi)

cell-9336900864

ڈاکٹر بختیار نواز (وارانسی)

میں سوز میر، غالب کی زباں ہوں
کبھی مومن کا انداز بیاں ہوں
وہ میری خواہشوں کی سر زمیں ہے
میں اس کی چاہتوں کا آسماں ہوں
مجھے دہرا رہی ہے ساری دنیا
نئے یگ میں پرانی داستاں ہوں
دیا ہے ایکتا کا درس میں نے
میں اردو ہوں، محبت کی زباں ہوں
کرم رب کا نواز ایسا ہے مجھ پر
میں دھرتی ہو کے رشک آسماں ہوں

(2)

موسموں کے استعارے دیکھنا
تم شب غم چاند تارے دیکھنا
کوئی میری خواہشوں کے پیڑ پر
طنز کا پتھر نہ مارے دیکھنا
زخم ،خوشبو،خواب ،منظر، آئینہ
زندگی کے رنگ سارے دیکھنا
ساتھ کیا دیں گی تری بیساکھیاں
ٹوٹ جائیں گے سہارے دیکھنا
جن کے ہونٹوں پر تبسم ہے نواز
ان کی آنکھوں میں شرارے دیکھنا

(3)

میرا رشتہ جناب مٹی سے
زندگی کامیاب مٹی سے
مجھ کو تعبیر میں گلاب ملے
میں نے گوندھا جو خواب مٹی سے
ہے نشہ مجھ کو اپنی مٹی سے
میری ساری شراب مٹی سے
مجھ کو پڑھنی ہے عمر بھر یہ کتاب
میرا سارا نصاب مٹی سے
خار و گل کا عجیب رشتہ ہے
ہے معطر گلاب مٹی سے
کتنے کم ظرف ہیں نواز جو لوگ
مانگتے ہیں حساب مٹی سے

(4)

کتنا بے رنگ ہے بھرم کا لباس
جب سے روشن ہے درد وغم کا لباس
دل کدورت سے پاک ہے کہ نہیں
خوبصورت ہے محترم کا لباس
مرمریں جسم ہے تراشا ہوا
کہکشاں ہے مرے صنم کا لباس
مہرباں مجھ پہ ہو گئیں خوشیاں
میں نے پہنا جو تیرے غم کا لباس
زیب تن کون کر رہا ہے نواز
امن کے شہر میں ستم کا لباس

2025 ka Fiction aur Fiction Tanqeed : Ek Jaeza by Prof. Aslam Jamshedpuri

(HOD Urdu CCS University, Meerut) cell-8279907070

پروفیسر اسلم جمشید پوری (صدر، شعبہء اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

۲۰۲۵ کا فکشن اور فکشن تنقید: ایک جائزہ

یہ سال بھی گذر گیا۔ نیا سال ۲۰۲۶ آ گیا۔ عمر ایک سال کم ہوگئی۔ یعنی وقت کے بے کراں سمندر میں، ایک بوند اور سما گئی۔ وقت کے اس سمندر میں گذشتہ سال بھی بہت سے جوار بھاٹا آئے۔ ادب بھی زمانہ سے متاثر ہوا۔ سال گذشتہ میں ادب میں کیا ہوا۔؟ کون سی تبدیلیاں آئیں، یہ بہت طویل ہیں۔ میں صرف فکشن اور فکشن تنقید کے جائزے تک ہی خود کو محدود رکھتا ہوں۔ ہاں اس بار سوانح کو بھی اپنے جائزے میں شامل کر رہا ہوں کہ اس میں بھی اچھا خاصا افسانوی رنگ ہوتا ہے۔ یہ جائزہ بھی میری دسترس تک محدود ہے۔ فکشن کے اس جائزے میں آپ دیکھیں گے کہ پوری دنیا میں اردو کے کون کون سے اہم ناول منظر عام پر آئے۔؟ افسانوی مجموعوں میں کیا کچھ تھا۔؟ افسانچے کیسے تھے۔؟ سوانح کا رنگ کیسا تھا۔؟ بچوں کی کہانیاں کتنی مزیدار تھیں۔؟ فکشن تنقید نے کیا کیا گل کھلائے۔؟ کس کو اٹھایا، کس تحریر پر طنز کے تیر چلائے۔؟ آیئے ان سوالوں کے جواب دیکھتے ہیں۔

ناول: اس سال بہت سے ناول شائع ہوئے۔ خاص کر عبدالصمد کا ''لازوال''، اختر آزاد کا ''جلتا پہاڑی سیّارہ''، شعیب نظام کا ''گردِ نیم شب''، راجیو پرکاش ساحر کا ''آتماؤں کا سراب''، تصنیف حیدر کا ''کہانی فروش''، اشعر نجمی کا ''کانگریس ہاؤس''، حمید شاہد کا ''مٹی آدم کھاتی ہے''، دیپک بدکی کا ''سیندور کی سوگندھ''، تنویر اختر رومانی کا جاسوسی ناول ''جرم کا زینہ''، نسیم انجم کا ''مٹّی کی دنیا''، ثمینہ نذیر کا ''سیاہ ہیرے''، نینا عادل کا ''مقدس

گناہ''، محمد صابر انصاری کا ''دیوار کے اس پار''، مشتاق احمد وانی کا ''جو کبھی دیکھا نہ تھا''، محمد صابر انصاری کا دوسرا ناول ''خواب یا حقیقت''، شاہد دلاور شاہ کا ''غیر مطبوعہ جیون''، سید سعید نقوی کا ''پانچویں سمت کا مسافر''، سہیل پرواز کا ''امرتسر کی بلّو''، عاصم بٹ کا ''پانی پہ لکھی کہانی''، خالد فتح محمد کا ''شہرِ مدفون''، احمد حسنین کا ''آ اب لوٹ چلیں''، وغیرہ شائع ہوئے۔

☆ جلتا پہاڑ سیارہ، اختر آزاد کا نیا ناول ہے۔ اختر آزاد نئی نسل کے نمائندہ فکشن نگار ہیں۔ یوں تو ان کی شہرت بطور افسانہ نگار مضبوط و مستحکم ہے، مگر ان کی ناول نگاری بھی منفرد ہے۔ اب تک ان کے دو اور ناول 'لیمی نیٹیڈ گرل' ۲۰۱۳ میں اور 'تھری سکسٹی ڈگری' ۲۰۲۲ میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اسی طرح وہ اردو کو کئی افسانوی مجموعے بابل کا مینار، سمپورا انسان کی گاتھا، سونامی کو آنے دو، خدا سے سوال، خالق کائنات کا جواب وغیرہ دے چکے ہیں۔ کثیر تعداد میں کتب کا شائع ہونا، اچھا لکھنے کی دلیل نہیں، مگر اختر آزاد کا اسلوب انوکھا ہے اور وہ موضوع کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔

اس ناول 'جلتا پہاڑ سیارہ' میں بھی انہوں نے الگ موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ منی پور کے فرقہ وارانہ فساد کے اسباب و علل کو تلاش کرتا یہ ناول، کوکئی اور میئتی فرقوں کے تصادم کی داستان ہے۔ ناول میں منی پور کا جغرافیہ، دلچسپی کے عناصر، فوج اور حکومت کا کردار، کوکئی اور میئتی فرقوں کی لڑائی، محبت کی کہانی۔۔ جیسے لوازم ہیں۔ آپ بھی دیکھیں۔:

''دیکھئے بھائی! لڑائی جھگڑے کبھی کسی مسئلے کو حل نہیں کرتے بلکہ اور بھی پیچیدہ بنا دیتے ہیں۔ جس سے باہر نکل کر امن قائم کرنا آسان نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔ اگر عقل سے کام نہیں لیں گے تو ان پہاڑوں کا امن و سکون درہم برہم ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے جب آپ لوگ امن کی بات کر رہے ہیں تو ہم اپنے لوگوں کو سمجھا دیں گے۔'' میئتی منی پوری فرنٹ کے صدر نے باتوں کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے آگے کہا۔ ''لیکن ماحول کون خراب کر رہا ہے؟ ہمیں تو ہمارا حق ملا ہے۔ ہم صرف اپنی خوشی منا رہے ہیں۔

ہماری خوشیوں میں ٹانگ اڑانے والے کو کیز کون ہوتے ہیں؟''

(جلتا پہاڑی سیارہ، اختر آزاد، ص۔ ۲۳)

☆ سیاہ ہیرے ،ثمینہ نذیر کا اہم ناول ہے ۔اس سے قبل ان کا افسانوی مجموعہ 'کلّو' ادب میں ان کا بھر پور تعارف کرا چکا ہے۔زبان و بیان پر ان کی دسترس ،موضوع کا انتخاب اور زندگی کی گونا گونی کو پیش کرنے میں ان کی مہارت ،علمیت اور فن سے وقفیت کا پتہ دیتی ہے ۔یہ ناول 'سیاہ ہیرے' دراصل ان کے ۱۸ سال افریقہ میں گذارے عرصے کا نچوڑ ہے۔انہوں نے لا جواب ناول لکھا ہے ۔انہوں نے افریقی زندگی کے نشیب وفراز کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔اپنے اندر جذب کر کے اسلوب کی دلکشی کے ساتھ ناول کے قالب میں ڈھالا ہے ۔ناول کے کردار لیلیٰ ،فاطمانا، امینا، ٹا، جھانوی ،نی نی فوتہ، یوسف، راجیو شرما، ماتا پرساد، سلیم ،میسو جلو، نی نی فاتا، چراغ، خدیجہ، کونڈے صرف کردار نہیں ہیں، بلکہ یہ زندگی کے وہ ہیرے ہیں جن جگ مگ سے اندھیرا اجالا پھیلتا رہتا ہے۔ناول کا ایک اقتباس حاضر ہے۔

''میں نے بمشکل جارائی کو اس بلا سے چھڑایا۔اس کی شعلہ بار نظروں سے، اس سڑی ہوئی گرمی میں بلا شبہ چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔مگر جارائی پر بھی آفرین تھی۔ اس نے مضبوطی سے بنڈ ہاٹ پاٹ اٹھا لیے تھے اور میری پیٹھ کے پیچھے پناہ لے کر برابر لڑائی کو جاری رکھے ہوئے تھی۔ میں نے کونا کری میں کبھی مردوں کو آپس میں گتھم گتھا دھینگا مشتی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یہ طویل القامت مرد ''کھسی'' لگتے تھے، جو تو تو میں میں تو گھنٹوں کرتے تھے مگر ہاتھا پائی بالکل نہیں۔آج لڑائی دیکھی تو وہ بھی عورتوں کی۔ میں نے مجمع منتشر کیا۔کونڈے بھی وہاں کھڑا مزے لے رہا تھا۔''

(سیاہ ہیرے، ثمینہ نذیر، ص۔ ۱۴۷)

حمید شاہد کے معروف ناول کا تیسرا ایڈیشن بھی اشاعت پذیر ہوا۔

☆ ''آتماؤں کے سراب'' راجیو پرکاش ساحر کا ناول ہے ۔اس سے قبل بھی

مصنف کے چار افسانوی مجموعے ایک بھیگے لمحے کی لمبی سڑک، پیاسی سبیلیں، احتیاط اور تعاقب زرد موسم کا، شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ یہ ان کا پہلا ناول ہے۔ واضح ہو کہ راجیو پرکاش نے عمر کا ایک لمبا وقفہ گذارنے کے بعد لکھنا شروع کیا۔ اس ناول میں بھی انہوں نے عجیب وغریب کہانی کو ناول کیا ہے۔ اس کے کردار سامنے کے ہیں۔ گنگا، نقوی ،کومل ،اسلم چچا، خان صاحب، ڈاکٹر ابھے جوشی ،سورج بھان سنگھ، چندن ، پروفیسر روی ،وغیرہ کرداروں اور مختلف واقعات کے گرد ناول گھومتا رہتا ہے۔ الموڑا، لکھنو، دہلی، گومتی ندی ،للوری گاؤں، ممبئی، بنگلورو، ہالے بیڈو، پرایڈ آف اودھ اپارٹمنٹس، کانپور ،دھول کھنڈ، لکھیم پور کا ذکر اور کرونا کو سمیٹتا یہ ناول پڑھنے لائق ہے۔

☆''مٹی کی دنیا''، نسیم انجم صاحبہ کا نیا ناول ہے۔ نسیم انجم اس شعبہ میں نئی نہیں ہیں، بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کا قلم بے تکان چلتا ہے۔ ان کے اب تک کئی ناول ،افسانوی مجموعے اور کالموں کا انتخاب شائع ہو چکے ہیں ۔ان کے پاس نہ موضوعات کی کمی ہے، نہ لفظی خزانے کی۔ مذکورہ ناول 'مٹی کی دنیا' ان کا ایک ایسا ناول ہے جو زندگی کی کوکھ سے نکلا ہے۔ اس میں سماج اور مذہب کی حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔ اس کے کردار ہماری دنیا کے لوگ ہیں۔ واقعات بھی روزمرہ کے ہیں۔ مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو اپنی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ ثمرینہ، دانیال، کامنی، انور، عاکف، مہر النساء کے شانوں پر ناول کا بوجھ ہے۔ ناول میں زندگی کی بے ثباتی ہے۔

''جی میں نے دیکھا کہ ہمارے گھر میں بہت سے مرد اور خواتین جمع ہیں، مرد زیادہ تر باریش ہیں۔ ان سب کے چہروں پر سنجیدگی نمایاں ہے، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا چھا جاتا ہے اور میرے سر سے میرا دوپٹہ تیز ہوا اڑانے کی کوشش میں مصروف ہے اور میں اپنے ننگے سر کو بار بار ڈھانپ رہی ہوں۔ پھر کیا دیکھتی ہوں کہ ہمارے لان میں لگا ہو تناور درخت اپنے پتوں سے آزاد ہو گیا ہے۔ آندھی بہت تیز چل رہی ہے۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے، لیکن میرا دوپٹہ میرے قابو میں ہے۔ اس کے بعد منظر بدلتا ہے، سب

کام معمول کے مطابق ہو رہے ہیں۔ اندھیرا روشنی میں بدل گیا ہے، اور اب ہم سب اطمینان کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔'' (مٹی کی دنیا، نسیم انجم، ص۔۲۱۱)

☆ مقدس گناہ، نینا عادل کا ناول ہے۔ نینا عادل کا پہلا ناول ہی ایسا ہے جو بہت سے ماہر ناول نگاروں پر بھاری ہے۔ اس کا انداز، زندگی کی کشاکش، کردار، واقعات کا گھماؤ، لفظوں کی چاشنی، مکالموں کا رچاؤ اور ناول کے نشیب و فراز بہت لطف دیتے ہیں۔ ناول کا نام ہی ایسا ہے کہ قاری اسے پڑھ کر ہی دم لیتا ہے۔ نجیبہ عارف ناول کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''یہ کہنا بھی انصاف نہ ہوگا کہ یہ صرف عورت کے گرد گھومتا ہوا بیانیہ ہے کیوں کہ ناول میں ایسے توانا مردانہ کردار تخلیق کیے گئے ہیں جنہیں پڑھ کر لگتا ہی نہیں کہ یہ کسی عورت کی تخلیق ہیں۔ آرٹ، جنس، سیاست، صحافت، نفسیات، فلسفے اور روحانیت کے منطقوں میں گھومتے پھرتے یہ کردار کہیں طویل مکالمے بول کر، تو کہیں لمبے لمبے خط لکھ کر اپنی ذہنی ریاضت کا حاصل بیان کرتے نظر آتے ہیں۔''

(نجیبہ عارف، مقدس گناہ، نینا عادل، ص۔۱۲)

ناول کی دلچسپی اور تحیر و تجسس قاری کو مضطرب رکھتا ہے۔ یہ قصہ پن کا کمال ہے۔ آپ بھی دیکھیں۔:

''یہ اختر بھائی کا بیٹا تو خوب آنکھوں میں بھرنے لگا ہے۔ رنگ ذرا دبا ہوا ہے، مگر نک تک سے بھی درست ہی ہے۔ ایک نظر میں تو، میں پہنچان ہی نہیں پائی۔ ابا تو اس کے دھان پان سے ہیں، بیگم اختر بھی شروع سے ہڈیوں کا ہار تھیں، یہ تازی گھوڑا کس پر چلا گیا امی؟ رکابیوں کے درمیان قاب کی جگہ بناتے ہوئے ہادیہ خالہ نے پوچھا۔ میں سپارہ پڑھنے والیوں کے ساتھ دسترخوان لگوا رہی تھی۔ خالہ کی بات سن کر لڑکیاں کھی کھی، کھی کھی کرنے لگیں۔ ہووں! چپ رہو، بے شرم لڑکیو۔ مغرب سے پہلے پہلے نیاز کا کھانا ختم ہو جانا چاہئے۔ خالہ نے ہم سب کو آنکھیں دکھاتے ہوئے جھڑکی دی۔''

(مقدس گناہ، نینا عادل، ص۔ ۱۰۳)

☆ سیندور کی سوگندھ، دیپک بدکی کا نیا ناول ہے۔ دیپک بدکی ہمارے اچھے فکشن نگار ہیں۔ کشمیری لوگوں کا درد و کرب بیان کرنے میں آپ کو مہارت ہے۔ آپ کی تحریریں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس سے قبل آپ کے ناول اپنا اپنا سچ، آزادی ،افسانوی مجموعیا دھورے چہرے، چنار کے نیچے، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، ریزہ ریزہ حیات، روح کا کرب، اب میں وہاں نہیں رہتا، پتوں پر لکھی تحریریں، افسانچے مٹھی بھر ریت، یہ کیسا رشتہ، شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نے صحت مند تنقید بھی کی ہے۔ اس ناول میں آپ نے سچیتا راٹور، بھاسکر بھاردواج، رام سرن راٹور، کوشل ورما، زبیدہ اختر، ودوشی ،میترئی۔ رنبیر چوہان ،کوشکی و دیگر کرداروں سے سجا یہ ناول زندگی کا سچا بیان ہے ۔دراصل یہ سچیتا کی کہانی ہے ۔اس نے عشق بھاسکر سے کیا، جو نچلی ذات کا تھا۔ گھر والوں کو یہ بات پسند نہ آئی ۔اس نے گھر والوں کی بات مان لی ۔کوشل ورما سے شادی طے ہوئی ۔بارات آئی اور بھاری بھر کم جہیز کے فقدان میں بارات واپس لوٹ گئی ۔پورے ناول میں کشمکش ہے ۔زندگی کے رنگ ہیں، مختلف روپ ہیں۔ ایک دلچسپ ناول ہے۔ جو سماج کا اثر بھی لیتا ہے اور اس پہ اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ ناول کا ایک اقتباس دیکھیں۔:

''بھاسکر، میں نے بہت سارے دکھوں کا سامنا کیا، پیار ہوا تو اس کی منظوری نہیں ملی ، شادی ہوئی تو جہیز نہیں دے پائی اور برات ڈیوڑھی سے واپس چلی گئی، پھر پاپا کا ہارٹ اٹیک ہو گیا اور اس کے ترنت بعد میری ممی بھی مجھ کو اکیلی چھوڑ کر چلی گئی، میں اکیلی پڑ گئی بالکل اکیلی، دائیں بائیں کوئی سہارا نہیں دکھائی دیا۔ کئی روز ذہنی دباؤ میں مبتلا رہی۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک آواز سی سنائی دی ''نہیں سچیتا تم اس حالت میں زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتی، اٹھو اور کمر کس لو، تم دنیا میں کچھ حاصل کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہو۔'' وہ لمحہ مجھے نئی زندگی بخش گیا۔'' (سیندور کی سوگندھ، دیپک بدکی، ص۔ ۱۶۴)

☆ گردِ سفر، شعیب نظام کا ناول ہے۔ شعیب نظام مشرقی اور مغربی ادب کا خاصا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ وہ ادب کی تمام خوش فہمیوں اور غلط بیانیوں سے واقف ہیں۔ اپنے ناول میں بھی انہوں نے زندگی سے آنکھیں چار کی ہیں۔ تہذیب وتمدن کو اپنی تحریر میں پیش کیا ہے۔ اعلیٰ خاندانوں کا رہن سہن، طرزِ زندگی، رکھ رکھاؤ، لوگوں کے ساتھ برتاؤ کو انہوں بہت خوبصورت طریقے سے بیان کیا ہے۔ آزادی سے قبل کی زندگی اور بعد کی افرا تفری، تقسیم اور فسادات کی ٹیس اور تہذیبی انتشار کو شعیب نظام نے خوبصورتی سے ناول کے قالب میں ڈھالا ہے۔ زبان کے ساتھ کھیلے ہیں۔ کرداروں کو انگلیوں پر نچایا بھی ہے اور انہیں فطری عمل کی آزادی بھی دی ہے۔ ناول کا ایک اقتباس دیکھیں۔:

''بیگم آنے جانے والی عورتوں سے کہتیں ملک بٹ گیا جتنا خون خرابہ ہونا تھا ہو چکا اب یہ فسادات کیوں ہو رہے ہیں مگر ان کی بات کا جواب نہ ان کے پاس ہوتا نہ سامنے والے کے پاس۔ اصل میں آگ تو بجھ چکی تھی مگر راکھ کے اندر اب بھی بہت سی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں وہ موقع بے موقع سطح پر آ ہی جاتی تھیں تب جا کر لوگوں کو پتہ چلتا تھا کہ آگ ابھی پوری طرح بجھی نہیں ہے جسے وہ راکھ سمجھ رہے تھے اس کے اندر ابھی چنگاریاں موجود ہیں۔ یہ بھی کسی کو نہیں معلوم تھا کہ چنگاریاں کبھی راکھ میں تبدیل بھی ہوں گی یا نہیں۔'' (گردِ سفر، شعیب نظام، ص۔ ۹۸)

☆ زوال، عبدالصمد کا تازہ ناول ہے۔ عبدالصمد ہمارے عہد کے ایک معتبر فکشن نگار ہیں۔ انہیں پہلے ہی ناول 'دوگز زمین'' کے لئے ساہتیہ اکادمی انعام مل چکا ہے۔ عبدالصمد ہمیشہ نیا موضوع لاتے ہیں۔ نئے مسائل اور زندگی کے نئے معاملات کو افسانہ اور ناول کرتے رہے ہیں۔ ان کے ناول عصری تقاضوں اور ضرورتوں سے لیس ہوتے ہیں۔ ان کے کئی نئے ناول مثلاً کشکول اور سسٹم کافی مقبول ہوئے۔ عبدالصمد کا مذکورہ ناول 'زوال' بھی آزادی سے قبل اور بعد کے جاگیردارانہ نظام کو مترشح کرتا ہے۔ ایک ہندو راجا، اپنی عیاشی کی وجہ سے مسلم طوائف سے نکاح کر لیتا ہے۔ جس کی اولادیں ہی

راجا کی موت کے بعد اس کی ملکیت کی وارث بنتی ہیں۔شرف الدین ایک معمولی نوکر سے اسٹیٹ کے مینیجر تک کا سفر طے کرتا ہے۔ناول کی کہانی زوال کی داستان سناتی ہے کہ کس طرح سمندر کے ساحل کی ریت مٹھی سے آہستہ آہستہ پھسلتی ہے۔ناول کا ایک اقتباس آپ بھی دیکھیں:

''مجھے لگتا ہے، اتنی جائیدادیں دکھ کر وہ بھی اچھے برے کی تمیز بھول جائیں گے اور اپنے باپ کے نقش قدم ہی پر چل پڑیں گے۔وہ تو بہت سی خصوصیات کے مالک بھی تھے، وہ گن ان میں بھی پیدا ہو جائیں گے، کہنا مشکل ہے۔وہاں کچھ لکھ پڑھ لیتے تو شاید ان کے اندر کی آنکھیں کھل جاتیں۔میں نے سب کچھ جان کر بھی انہیں اس لئے وہاں چھوڑ رکھا تھ کہ شاید کسی وقت ان کی عقل و سمجھ کے دروازے کھل جائیں۔''

(زوال، عبدالصمد، ص۔۳۷)

☆ جرم کا زینہ، تنویر اختر رومانی کا جاسوسی ناول ہے۔تنویر اختر رومانی اچھے ادیب ہیں۔وہ افسانہ، افسانچہ، تنقید، ادبِ اطفال کے ماہر ہیں۔انہوں نے ابنِ صفی کو بہت پڑھا ہے۔ابنِ صفی کے کردار بھی ان کے اندر گھلے ملے ہیں۔یہ تنویر صاحب کا پہلا ناول ہے۔لیکن مطالعے سے لگتا نہیں، ان کی مہارت ان کی مشاقی کی گواہ ہے۔مذکورہ ناول میں مصنف نے دکھایا ہے کہ کس طرح قتل ہوتا ہے اور مجرم کس طرح جرایم کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔سیٹھ ہیرالال، منورما، کانتی دیوی، فریدی، سعید اور دیگر کرداروں سے لیس یہ ناول قدم قدم پر تجسس اور تحیر رکھتا ہے۔ناول کا ایک ٹکڑا دیکھیں:

''کیسی آواز تھی؟'' حمید نے سوال کیا۔

''ایسا لگا حضور جیسے کوئی پتھر یا لوہے کا ٹکڑا ہو۔۔۔۔چھوٹا سا!''

''پھر؟''

''میں سمجھا شاید سیٹھ جی اٹھے ہوں۔۔۔۔۔ان کے ہاتھ سے کوئی چیز گر گئی ہو۔۔۔۔۔اکثر سیٹھ جی ایک دو بار اٹھتے تھے۔''

''کیوں؟''

''حضور۔۔۔۔۔مالک کئی دنوں سے کچھ پریشان نظر آتے تھے۔۔۔۔۔رات میں اٹھتے اور ہم سب کو تاکید کر کے سوتے تھے۔''

''ہاں صاحب!'' ایک ملازم نے مرلی کی تائید کی جو مقتول کے خورد ونوش کی خدمت پر مامور تھا۔

''ہوں۔۔۔۔تمہارا نام؟'' حمید چونک کر سیدھا بیٹھ گیا۔تفتیش سے کچھ روشنی مل رہی تھی۔ (جرم کا زینہ،تنویر اختر رومانی،ص۔۲۷)

☆ کانگریس ہاؤس،اشعر نجمی کا تازہ ناول ہے۔اشعر نجمی بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن آج کل وہ فکشن میں بھی کامیاب طبع آزمائی کر رہے ہیں۔خاص کر وہ اب تک کئی ناول 'اس نے کہا تھا' 'صفر کی توہین' اور 'جوکر' تحریر کر چکے ہیں۔دو اور ناول 'شوگر ڈیدی' اور 'وسرجن' عنقریب منظر عام پر آنے والے ہیں۔ایک افسانوی مجموعہ 'گمشدہ خوابوں کی رپورٹ' گذشتہ سال شائع ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ آپ کی ادارت میں ایک مختلف قسم کا سہ ماہی رسالہ 'اثبات' مستقل شائع ہوتا رہتا ہے۔

'کانگریس ہاؤس' اردو کا ایک منفرد ناول ہے جس میں بہت سارے قصے ہیں،عورت ہے،ظلم ہے،تاریخ وتہذیب ہے،فکری نظام ہے۔یہ سب مل کر ایک الگ بیانیہ تشکیل دیتے ہیں۔ایک ایسا بیانیہ جس میں کئی بیانیے ضم ہو جاتے ہیں۔اس میں قصے در قصے ہیں اور وقعات کے وقوع پذیر ہونے کے روایتی اسباب نہیں ہیں بلکہ ایک ایسی کیفیت کا بیان ہے جو لمحہ بھر کو شل کر دیتی ہے۔یہ ایک مختلف قسم کا احتجاج ہے جو ناول کے بین السطور سے ابھرتا ہے۔ناول سے متعلق ابرار مجیب کی رائے ہے۔

''یہ ناول کسی ہیرو کی داستان نہیں،نہ ہی کوئی مرکزی کردار پوری کہانی کو اپنے شانے پر اٹھائے ہوئے ہے۔مرکزی کردار بظاہر پس منظر میں ہے،حتیٰ کہ کہانی اس کی نہیں،لیکن جب ناول انجام کی جانب بڑھتا ہے تو یہی حاشیے کا کردار سماجی وسیاسی بیانیے کے مرکز

میں آجاتا ہے، اور اس کی ذات پورے بیانیے کی علامتی قرأت بن جاتی ہے۔ بیانیہ کی مختلف پرتوں کو باہم کرنے کا یہ ہنر کسی حد تک داستان نگاری میں ملتا ہے۔ اس تکنیک کا عمدہ استعمال کنڈیرا کے یہاں ہوا ہے یا دستوئفسکی کے یہاں۔''

(ابرامجیب، کانگریس ہاؤس، اشعر نجمی، فلیپ)

☆ دیوار کے اس پار، محمد صابر انصاری کا ناول ہے۔ اس سال ان کا ایک اور ناول 'خواب یا حقیقت' بھی شائع ہوا ہے۔ ایک سال میں دو ناولوں کا شائع ہونا بھی ایک نئی بات ہے۔ 'دیوار کے اس پار' ایک تجرباتی ناول کہلائے گا کہ اس میں بہت سے مکالموں، ناموں اور اہم واقعے کو 'بولڈ' حرفوں میں لکھا گیا ہے۔ اسے آپ مکالماتی ناول بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں کہانی بھی ہے، کردار (فیضان، حاجی عبد الحکیم، بی بی انوری، زاہدہ، ماہ نور، وغیرہ) ہیں، زندگی کی کشمکش ہے۔ دو تہذیبوں کا ٹکراؤ ہے۔ ناول کا نظم کی طرح لکھنا اسے الگ کرتا ہے۔ کبھی کبھی آزاد نظم کا گمان ہوتا ہے۔ 'خواب یا حقیقت' میں بھی یہ رنگ کم کثافت میں موجود ہے۔ دیوار کے اس پار کا ایک اقتباس دیکھیں:

ماہ نور سے جھانکا۔
فیضان دیوار کے پاس کھڑا تھا،
ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کاغذ مروڑتا ہوا۔
اس کی نظریں سیدھی جالی کے پار آنگن میں تھیں۔
زاہدہ کو پہلے کچھ پتہ نہ چلا،
پھر تسبیح کے دانے رک گئے۔
اسے یوں لگا جیسے ہوا میں کوئی نیا رنگ گھل گیا ہو،
وہ رنگ جو روشنی سے نہیں، نظر سے بنتا ہے۔

(دیوار کے اس پار، محمد صابر انصاری، ص۔ ۹۹)

☆ شہرِ مدفون، خالد فتح محمد کا ناول ہے۔خالد فتح محمد ہمارے سینئر فکشن نگار ہیں۔ان کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔آپ کے کئی ناول اور افسانوی مجموعے شائع ہو کر نہ صرف مقبول ہو چکے ہیں بلکہ قاری کے دلوں میں سما چکے ہیں۔آپ نے درجن بھر ناول تحریر کئے خاص کر 'کوہِ گراں' 'سود و زیاں کے درمیاں' 'خلیج' 'نیا گھر' 'شہرِ مدفون' 'ایک زندگی' ایسے ناول ہیں، جن سے مصنف نے بہت شہرت بٹوری۔اسی طرح ان کے کئی افسانوی مجموعے اور تراجم ہیں۔

مذکورہ ناول 'شہرِ مدفون' رائے بوچہ مل نامی ایک خاندان کی کہانی ہے۔جو کئی صدیوں سے طاقت کا استعمال دیکھتا آ رہا ہے۔ملک کی تقسیم سے قبل اس کی طاقت اور بعد میں اس کے انتشار کی دردناک کہانی ہے۔اس میں مذہب کی کوئی بات نہیں، زمینوں پر قبضے اور اس کے بٹوارے کے قصے ہیں۔ایک خاندان شہر میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر منتشر ہو کر تنکا تنکا بکھرتا ہے۔خالد فتح محمد نے قلم کا جادو جگایا ہے۔اپنی سحر نگاری کی گرفت میں قاری کو لے لیا ہے۔یہ ناول اردو کی روایت میں اضافے کا درجہ رکھتا ہے۔

☆ جو کبھی دیکھا نہ تھا، مشتاق احمد وانی کا پہلا ناول ہے۔اس سے قبل ان کے کئی افسانوی مجموعے، تنقیدی کتب، سوانح وغیرہ سامنے آ چکے ہیں۔مشتاق احمد وانی نئی نسل کے قبولِ خاص و عام فکشن نگار اور ناقد ہیں۔ان کی تحریریں جموں کشمیر کے بہت سارے مسائل پر اچھی روشنی ڈالتی ہیں۔

مذکورہ ناول 'جو کبھی دیکھا نہ تھا' میں مصنف الگ ہی رنگ میں نظر آتا ہے۔یہاں آپ کو سماج کی عکاسی ملے گی، اسلامی رنگ دکھائی دے گا، سفر نامے کے مزہ کا احساس ہوگا، کرداروں کی کشمکش ملے گی، یونیورسٹی اور کالج کا ماحول، واقعات کی جزئیات، حق گوئی اور بے باکی، قصہ پن کی موجودگی، تحیر و تجسس کا بیان، خیالات کا تصادم، گھاٹی کے معاملات، انسان کے مسائل، انسانیت کی تلاش، تہذیبوں کا انضمام اور بہت کچھ ملے گا۔ناول ایک اقتباس دیکھیں۔:

''ثناءاللہ نے سب سے پہلے پہننے کے کپڑے بدلے، وضو کیا پھر نماز ظہر پڑھی اور اس کے بعد اس نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ اسے یہ جان کر خوشی محسوس ہوئی کہ اس سے بڑے دو بھائیوں احسان احمد، شکیل احمد اور اس سے بڑی دو بہنوں عابدہ اور ساجدہ کے رشتے کی بات گھر والوں نے کر دی ہے۔ نو ماہ کے بعد ثناء اللہ کے ان بھائی بہنوں کی اکٹھی شادی ہوگی۔ احسان احمد نے درزی کا کام سیکھ لیا تھا اور شکیل احمد نے ترکھان کا کام جبکہ محمد حنیف نے ڈھول نما لکڑی کی پیٹیوں میں شہد مکھیوں کو قید کرنے اور ان سے شہد تیار کرانے میں مہارت حاصل کر لی تھی۔''

(جو کبھی دیکھا نہ تھا، مشتاق احمد وانی، ص۔ ۴۷)

☆افسانوی مجموعے:

اس سال کچھ افسانوی مجموعے بھی شائع ہوئے۔ ایم۔ مبین کا ''پرائی کوکھ کا درد''، مسعود تنہا کا ''ٹھوکر نیاز بیگ''، عشرت معین سیما کا ''خدا کے ہوتے ہوئے''، اسلم جمشید پوری کا ''شکوہ جوابِ شکوہ''، دانش حماد جاذب کا ''نیم پلیٹ''، اسلم جمشید پوری کا ''گئو دان سے پہلے'' (تیسرا ایڈیشن) قطرہ قطرہ زندگی (نسیم انجم) ننگا شاہ (شاداب رشید) ثمینہ نذیر کا ''کلّو'' وغیرہ۔

☆ ننگا شاہ، شاداب رشید کے افسانوں کا اولین مجموعہ ہے۔ ساجد رشید کی موت کے بعد کم عمری میں شاداب نے ان کی ادبی وراثت کو سنبھالا۔ نہ صرف 'نیا ورق' کی ادارت کی ذمہ داری کو بخوبی نبھایا بلکہ اچھے اور معیاری افسانے قلم بند کرنا بھی شروع کئے۔ آپ کے تعلق سے محمد اسلم پرویز نے صحیح لکھا۔

''گذشتہ دہائی میں بمبئی کے افسانوی منظر نامے پر جو افسانہ نگار نمودار ہوئے ان میں ایک اہم نام شاداب رشید کا ہے۔ 'نیا ورق' کی طرح شاداب رشید کے افسانے بھی معاصر کہد کے ثقافتی زوال، سیاسی استحصال، معاشی و ذہنی انتشار کے باوجود قاری اور قلم کار کے درمیان رابطے کا ایک معنی خیز پل کی تعمیر و تشکیل کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی معنویت

اسی سچائی میں عیاں اور نہاں ہے۔'' (ننگا شاہ، محمد اسلم پرویز، فلیپ)

شاداب رشید کے افسانے دور سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ وہ ممبئی کی ادبی محفلوں میں افسانہ نگار کے طور پر خاصے مشہور ہیں۔ اس مجموعے میں کل ۱۳ افسانے شامل ہیں۔ ہر افسانے کا موضوع اور ٹریٹمنٹ الگ ہے۔ ننگا شاہ، کتابستان، وظیفہ، قیامت کی نشانی، چوتھا سوال، تالاب کے مینڈک، چھپکلی وغیرہ نے کافی متاثر کیا۔ ان افسانوں میں عصری حقیقت ہے۔ انداز منفرد ہے، اسلوب میں جان ہے۔ وقتِ ضرورت جنسیت کا اظہار بھی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔:

''قریب پہنچنے پر میں نے بڑی عجیب بات دیکھی۔ ننگا شاہ پالتی مارے بیٹھا ہے اور لگ بھگ تیرا چودہ سالہ لڑکی اس کی گود میں بیٹھی ہوئی ہے۔ ننگا شاہ اسے زور سے بھینچے جھوم رہا ہے اور لڑکی اس کی گود میں بیٹھی کسمسا رہی ہے۔ میں یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ لیکن وہاں موجود تمام لوگ بڑی عقیدت سے اس کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں پیر پٹکتے ہوئے وہاں سے نکل آیا۔ میں خود کو لعنت ملامت کرنے لگا کہ آخر میں وہاں گیا ہی کیوں!'' (ننگا شاہ، شاداب رشید، ص۔ ۴۲)

☆ قطرہ قطرہ زندگی، نسیم انجم کے افسانوں کا تازہ مجموعہ ہے۔ وہ ایک ماہر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں زمینی سچائی ملتی ہے۔ وہ سچے واقعات کو اپنے اسلوب کی چاشنی میں افسانے کے قالب میں ڈھال دیتی ہیں۔ اس سے قبل ان کے افسانوی مجموعے دھوپ چھاؤں، آج کا انسان، گلاب فن اور دوسرے افسانے، شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کے ناول کائنات، نرک، پتوار، آہٹ، سرِ بازار رقصاں اور مٹی کی دنیا، آ چکے ہیں۔ ان کا افسانہ 'قطرہ قطرہ زندگی' ایک متاثر کن افسانہ ہے جس میں ایک قریب المرگ بلکہ مر چکے انسان کی بے بسی کی دکھ بھری داستان ہے۔ اپنے بچے، قریبی رشتہ دار اور دوسرے لوگ اسے نوچ رہے ہیں کہ وہ مطلبی ہیں، انہیں کسی کے مرنے سے کیا سروکار، وہ تو صرف پیسہ چاہتے ہیں۔

''بہت ساری آوازیں، میری سماعت سے ٹکرا رہی ہیں۔ میرے قریب سے برگوشیاں ابھر رہی ہیں۔

''بڑا ہی بے ایمان تھا، سارے گھر پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا، اس کوٹھی میں کم سے کم ۵۰ لاکھ کا حصہ میری بہو کا ہے۔''

''یتیم بھتیجے، بھتیجی کا بھی مال ہڑپ کر لیا ہے۔ بچے کب سے آس لگائے بیٹھے تھے۔''

''ارے! جو بویا وہ ہی کاٹا ہے۔ دیکھ لو میت گھر میں پڑی اولاد مال واسباب کا بٹوارہ کر رہی ہے۔'' یہ تیسری عورت کی آواز تھی۔

''شکل پر ذرا نور نہیں ہے، راشی جو تھا بڑی تکلیف میں مرا ہے۔''

(قطرہ قطرہ زندگی، نسیم انجم، ص۔ ۲۰)

☆ کلّو، ثمینہ نذیر کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ثمینہ نذیر مختلف قسم کی ادیبہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں روایت کی خوشبو بھی اور زمانے کا نیا پن بھی۔ وہ اپنے آس پاس سے ہم جیسے زندہ کردار اور ان کی کشمکش کو موضوع بناتی ہیں۔ مجموعہ ''کلّو'' میں ان کے چھ افسانے اور دو ڈرامے شامل ہیں۔ ہر افسانہ مختلف موضوع لئے، انداز جدا اور مخصوص اسلوب کی چاشنی میں الگ جاذبیت لئے ہوئے ہے۔ مجموعے کا سب اثر دار افسانہ، ٹائٹل افسانہ، کلّو ہی ہے۔ جس میں حکیم شطاری، مشتری بانو اور کلّو اہم کردار ہیں۔ ان کے افعال ہیں تو زندگی کی کشمکش اور اس کا ردّ عمل بھی ہے۔ لس بین پر ایک بہت اچھا افسانہ ہے۔ خود شمیم حنفی ان الفاظ میں اس افسانے کی تعریف کرتے ہیں۔

''کلّو ایک دلچسپ کہانی ہے، اپنی زبان، بیان اور موضوع ہر لحاظ سے۔ کہانی کا فطری بہاؤ، کردار سازی کے عمل میں مصنفہ کی مہارت اور روزمرہ زبان پر، محاورے اور قاری کو اپنی گرفت میں لینے کی صلاحیت غیر معمولی ہے۔'' (شمیم حنفی، دہلی، فلیپ)

افسانہ کلّو میں واقعات ایک دوسرے میں مدغم ہو کر، مجموعی تاثر بناتے ہیں۔ حکیم شطاری۔ گاؤں سے واپس لوٹتے ہیں تو بیگم کے پاس جانے کی تیاری کرتے

ہیں۔خوب کشتے وغیرہ استعمال کرتے ہیں،مگر انہیں بیگم اور کلّو کے تعلقات کے رخ کا پتہ ہی نہیں۔آپ بھی افسانے ایک اقتباس دیکھیں۔

''اتنے میں بے قرار ہو کر حکیم شطاری باہر چلے آئے۔کشتے کی گرمی سے جاڑے کی اس رات میں پسینے بہہ رہے تھے۔کرتا پاجامہ اتار تہبند باندھ رکھی تھی۔گنجا سر، غصے سے ابلتی آنکھیں، بالکل راون کا سچا روپ معلوم دے رہے تھے۔آگے بڑے کہ کلو راڈ کو باہر نکالیں اور بانو کو گھسیٹ کر اندر لے جائیں۔اتنے میں حکیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مشتری بانو آگے بڑھیں۔کلو کا ہاتھ تھاما، اسی مہندی بھرے سرخ ہاتھ سے جس میں دھانی چوڑیاں جھنک رہی تھیں۔منہ میں پان بھرا تھا۔اگلدان قریب تھا مگر جان بوجھ کر حکیم کی طرف منہ کر کے پیک تھوکی۔''تھو!'' اور کلو کا کرخت ہاتھ مضبوطی سے تھامے جھپاک سے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔''(''کلّو''ثمینہ نذیر،ص۔)

☆''پرائی کوکھ کا درد'' ایم مبین کا چھٹا افسانوی مجموعہ ہے۔ایم مبین ہمارے سینئر فکشن نگار ہیں۔ان کے کئی ناول ،افسانوی مجموعے اور ادبِ اطفال سے متعلق تحریریں سامنے آچکی ہیں۔ان کے افسانے عصری مسائل کو اپنے ٹریٹمنٹ سے زمانے کی آواز بنا دیتے ہیں۔''پرائی کوکھ کا درد'' میں ان کے ۲۰ افسانے شامل ہیں۔یہ سبھی سماج کے موجودہ حالات کو مختلف انداز میں پیش کرتے ہیں۔بعض افسانے عفریت ،تماشا،انیمل،حقِ وراثت ،کلکاری ، پرائی کوکھ کا دد،عبدل پنکچر والا،سونے کے دانت ،ساٹھ روپے والا کِس ،وغیرہ اچھے افسانے ہیں۔ٹائٹل افسانہ 'پرائی کوکھ کا درد،ایک ابہترین افسانہ ہے۔اس میں شیکھر،سریش اور بڑھی کا کی، کرداروں کے درمیان کی کشمکش،قاری کو اپنی لگتی ہے۔افسانے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

''مجھے پتہ ہے کا کی۔تمہارا وہ بیٹا کون ہے؟ مگر اپنی قسم کی وجہ سے تم اپنے بیٹے کو بھی بیٹا نہیں کہہ سکتی۔تمہارا بیٹا وہ سامنے بنگلے والا سریش سیٹھ ہے۔''اس نے ایک اعتماد سے کہا تو کا کی کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھرے۔

سویرے جب وہ جاگا تو کا کی سوئی ہوئی تھی اس نے جگانے کی کوشش کی لیکن وہ تو ہمیشہ کے لیے گہری نیند سوگئی۔'' (پرائی کوکھ کا درد، ایم۔مبین، ص۔۶۱)

☆ خدا کے ہوتے ہوئے، عشرت معین سیما کا افسانوی مجموعہ ہے۔ نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔خوف و دہشت، سیاسی اٹھا پٹھک، مارشل لاء، فوجی آمریت، عورتوں کی آزادی، مرد اساس سماج، سماجی برائیاں، زندگی میں مذہبی مداخلت، آنر کلنگ، رشتوں کی بے اعتباری، دہشت گردی، اقتصادی معاملات، عالمی دباؤ وغیرہ مسائل کے ساتھ یوروپ کی زندگی، ہر معاملے میں آزادی، مرد عورت کا خلط ملط ہونا، بے انتہا ترقی، ذرائع نقل وحمل کی برق رفتاری، انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کا بہترین استعمال، انسان کو بھی مادہ سمجھنے کی بری عادت نے عشرت کو افسانوں کے کردار اور پلاٹ بخشے ہیں۔ان کے افسانے موجودہ انسانی سماج کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ہمارے آس پاس کے یہ کردار اور ان کی کہانیاں سماج کی سچی اور درد بھری کہانیاں ہیں۔ان کا عکس نہ صرف افسانہ نگار کو بلکہ قاری کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتا ہے اور کبھی خوشی تو کبھی غم دیتا ہے۔اور خوشی کی کوئی حد ہوتی ہے نہ غم کی کوئی سیما۔

عشرت معین سیما کا تیسرا مجموعہ ''خدا کے ہوتے ہوئے'' عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ان کا پہلا مجموعہ ''گرداب اور کنارے'' جبکہ دوسرے مجموعے ''دیوار ہجر کے سائے'' کی اشاعت کو وڈ سے کچھ پہلے ہوئی۔آپ ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں۔آپ کے شعری مجموعہ ''جنگل میں قندیل، آئینہ مشکل میں ہے، باہتمام جنوں۔۔'' اور دیگر کتب میں ''اٹلی کی جانب گامزن، جرمنی میں اردو، اداریہ نویسی: پاکبان کے اداریے، تذکرے اور تبصرے، دیس بدیس کے ملّا جی، سنو کہانی، پڑھو کہانی،'' ہیں۔

'خدا کے ہوتے ہوئے مجموعے میں عشرت معین سیما کے ۲۲ افسانے شامل ہیں۔یوں تو یہ سبھی افسانے سنجیدہ قراءت اور مطالعے کے متقاضی ہیں لیکن کچھ افسانے تو لاجواب ہیں۔دل پھینک، احساس، دشتِ تنہائی میں، بوئے قفس، میں کیسے جیوں رے

،خدا کے ہوتے ہوئے اچھے افسانوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔مجموعے کا ٹائٹل افسانہ ،خدا پر اعتماد میں اضافہ کرتا ہے کہ موت ،زندگی ، پریشانی ،خوشی وغم سب کا مالک تو خدا ہے۔آج ہمیں خدا سے زیادہ اسباب پر بھروسہ ہے۔

☆''نیم پلیٹ'' دانش حماد جاذب کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔اس سے قبل ۲۰۱۰ میں ان کا افسانوی مجموعہ'' بکھرے موتی'' شائع ہو چکا ہے۔دراصل جاذب کے افسانے مختصر اور اثر دار ہوتے ہیں۔ان کے یہاں موضوع کی رنگا رنگی ملتی ہے۔ان کے افسانوں میں رنگ بدلتی زندگی ہوتی ہے۔اس مجموعے میں ان کے ۱۶ افسانے شامل ہیں جن میں سے بعض غور فکر کی دعوت دیتے ہیں۔نیم پلیٹ ،نامی افسانہ مجموعے کا سرنامہ ہے۔اس نام سے طارق چھتاری کی مشہور کہانی بھی ہے۔حماد جاذب نے دکانوں اور تجارت گاہوں ،اسپتالوں پر نام لکھے جانے کے سرکاری حکم نامے کو موضوع بنایا ہے ۔ایک منتری کی عجیب کہانی کا ٹکڑا دیکھیں۔:

''ہر دکان ہر کلینک کا بورڈ پڑھتے گئے مگر مطلوبہ کلینک یا اسپتال کی خواہش میں وہ آگے بڑھتے گئے۔ان کا بھاشن ان کے ذہن میں گونج رہا تھا۔کہیں نہ کہیں اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اپنی تقاریر سے دیش بھر میں میری الگ پہچان بن گئی ہے تو پھر کیسے وہ کسی ایسے کلینک یا اسپتال میں جاتے جن کے خلاف وہ اب تک زہر اگلتے رہے تھے۔کار آزاد نگر کراس کر کے سبھاش نگر میں داخل ہوئی یہاں بھی کلینک وغیرہ بند تھے تھوڑا اور آگے بڑھنے پر ایک کلینک کھلا دیکھ کر نیم پلیٹ دیکھا'' مشرا کلینک'' تو جلدی سے اترے اور بیٹے کو ڈرائیور کی مدد سے کلینک کے اندر لے گئے۔''

(نیم پلیٹ،دانش حماد جاذب،ص۔)

☆ٹھوکر نیاز بیگ،مسعود تنہا کا مجموعہ ہے۔اکیسویں صدی کی نوجوان نسل سے تعلق رکھنے والے منفرد فکشن نگار مسعود تنہا بھی ہیں۔ان کے قلم کی بے باکی اور بے خوفی انہیں دوسروں سے الگ کرتی ہے۔ان کی تحریر کا خاموش اور ادبی اظہار،احتجاج کرنے

والوں کی صف میں امتیاز بخشتا ہے۔ان کے کئی افسانے اور کئی مائیکرو فکشن کے اندر جو درد و کرب اور احتجاج ہے وہ انہیں عصری حسیت عطا کرتا ہے ۔مسعود تنہا نے اپنے اس مجموعے میں افسانے اور مائکرو فکشن شامل کئے ہیں۔ان کے افسانے پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے اردگرد کی حقیقتوں نے افسانوں کا بھیس بدل لیا ہے۔ان میں فریب و دھوکا دینے والے کردار بھی ہیں۔کمیشن کو اپنی زندگی کا معاش بتانے والے بھی ہیں۔خاموشی سے اپنا گھر تاہ و برباد کرنے والے لوگ بھی ہیں۔ذات برادری اور مذہب سے اوپر اٹھ کر اپنوں تلاش کرتے سرحد کے پار کے کراہتے لوگ بھی ہیں۔روپے پیسوں میں رشتوں کو تولنے والے کردار بھی ہیں۔وفا اور ہم آہنگی کے بوجھ تلے دبے افراد بھی ہیں۔غرض دنیا کا تماشا،جذبات کا کھیل،گھر کی جگہ لیتے مکان،رشتوں کا سودا کرتے لوگ،کمیشن کو ذریعہء معاش بنانے اور لڑکیوں کا مستقبل خراب والے بے ضمیر،سیاست کی بدعنوانیاں وغیرہ یعنی زندگی کا ہر پہلو اجاگر ہو گیا ہے۔گئودان سے پہلے اور شکوہ جواب شکوہ (اسلم جمشید پوری) کے تین تین ایڈیشن آئے۔

☆**فکشن تنقید:**

فکشن شناشی (مقصود دانش) خواتین فکشن نگار (ڈاکٹر احسن ایوبی) مہاراشٹر میں اردو ناول (شہناز رحمٰن) جہانِ افسانہ (ڈاکٹر ریاض توحیدی) منٹو کے نمائندہ کردار (ڈاکٹر نعیم صدیقی امروہوی) افسانچہ اور افسانچہ نگار (اسلم جمشید پوری) محمد علیم اسماعیل بحیثیت افسانہ نگار (فردوس انجم) اردو فکشن: تفہیم و تجزیہ (ابراہیم افسر) ڈاکٹر ریاض توحیدی: تخلیقی و تنقیدی جہات (ڈاکٹر شاہ فیصل) وحشی سعید: فن اور فروغِ ادب کا استعارہ (ڈاکٹر شاہ فیصل) ہم عصر اردو افسانہ: تنقیدی تناظر (فکشن ڈاکٹر عشرت صبو حی) قاضی عبد الستار پر مونو گراف (ہمایوں اشرف) ابنِ صفی: کردار نگاری اور نمائندہ کردار (طیب فرقانی) پنڈت رتن ناتھ سرشار (مرتب: ڈاکٹر ادریس احمد) وغیرہ۔

☆ پنڈت رتن ناتھ سرشار (مرتب: ڈاکٹر ادریس احمد) دراصل غالب انسٹی

ٹیوٹ سے شائع شدہ کتاب ہے۔ یہ پنڈت رتن ناتھ سرشار پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذریعہ کرائے گئے او دوروزہ قومی سیمینار بعنوان ''پنڈت رتن ناتھ سرشار: شخص، عہد اور ادبی جہات'' میں پیش کئے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔ موضوع کی افادیت اور مناسبت سے مرتب نے اس میں پریم چند، فیض احمد فیض، انتظار حسین، اور نیّر مسعود کے مضامین شامل کئے ہیں۔۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ رتن ناتھ سرشار کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

☆''افسانہ اور افسانہ نگار'' ڈاکٹر نفیس عبدالحکیم کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ اس کتاب میں افسانہ سے متعلق معروف ناقد پروفیسر علی احمد فاطمی کے مضامین ہیں۔ آج کل اردو میں یہ رواج عام ہو گیا کہ مصنف کے مضامین، افسانے، شاعری اور ناول کوئی دوسرا مرتب کرتا ہے۔ علی احمد فاطمی کا اختصاص ہی فکشن تنقید ہے۔ انہوں نے اردو ناول اور افسانے پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کتاب میں ان کے اردو افسانے کے فن اور مختلف موضوعات پر دس مضامین اور مختلف افسانوں، افسانوی مجموعوں اور انفرادی افسانہ نگاری پر ۲۸ مضامین شامل ہیں۔ یہ سبھی مضامین بہت معیاری اور علی احمد فاطمی کی نظر کے غماز ہیں۔ ان کے مطالعے سے افسانے کی باریکیوں اور متعدد افسانہ نگاروں کے طرز کا پتہ چلتا ہے۔

''کہانی کا فن اگر چہ کہنے سننے کا فن ہے عام طور پر تفریح طبع کی حد تک محدود کیا جاتا رہا ہے۔ اس خیال کو لے کر آج بھی بعض بزرگوں کی آراء میں تبدیلی نہیں آئی ہے، وہ ادب کا مطلب شاعری اور شاعری کا مطلب غزل گوئی سے ہی لیتے ہیں۔ ادب اور تفریح کے اس تصور نے بھی گمراہیاں پھیلائی ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بڑے سے بڑے کہانی کار نے سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع کے ساتھ دلکشی و دلچسپی کے عناصر قائم رکھے ہیں کہ کہانی کی پہلی شرط اس کا کہانی پن ہے جس میں دلچسپی یعنی کہ پڑھانے جانے والی کیفیت کا ہونا نا گزیر ہے اور کوئی کہانی جس میں دلچسپی اور سنجیدگی نہ ہو ایسا بھی ضروری نہیں لیکن ان سب کا انحصار ہم اس پر کرتے ہیں کہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ کہانی کار یا تخلیق کار کا

اصل مقصد کیا ہے۔'' (افسانہ اور افسانہ نگار، علی احمد فاطمی، ص۔ ۴۵)

☆''فکشن تنقید: روایت اور عصری منظر نامہ'' ڈاکٹر ارشاد سیانوی کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ ۶۱۰ صفحات کی اس کتاب میں مرتب نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ فکشن تنقید کے مفہوم و معانی اسکالرز کو بہ آسانی سمجھ میں آسکیں۔ انہوں نے پانچ ذیلی عنوانات کے تحت پوری فکشن تنقید کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ پہلا ذیلی عنوان ''داستان کی تنقید'' لیا ہے۔ اس عنوان کے تحت چار مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ جن میں پروفیسر ابن کنول اور پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی کے مضامین بھی ہیں۔ جو اس شعبے کے ماہرین مانے جاتے ہیں۔ دوسرا ذیلی عنوان ''ناول کی تنقید'' ہے۔ اس زمرے میں پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر قدوس جاید اور پروفیسر صغیر افراہیم جیسے لوگوں کے اہم مضامین ہیں۔ تیسرا حصہ ''افسانے کی تنقید'' ہے۔ اس میں پروفیسر صادق، پروفیسر طارق چھتاری اور پروفیسر سیما صغیر کی تحریریں شامل ہیں۔ چوتھا خانہ ''''افسانچہ تنقید'' کا ہے۔ اس خانے میں پانچ مضامین شامل ہیں۔ محمد بشیر مالیر کوٹلوی، ڈاکٹر ایم اے حق اور ڈاکٹر عظیم راہی جیسے افسانچے کے پارکھوں کے مضامین ہیں۔ آخر میں ''ڈرامہ تنقید'' کو بھی شامل کتاب کیا ہے۔ اس کے تحت بھی پانچ اہم مضامین لئے گئے ہیں، خاص کر عارف نقوی، ڈاکٹر سنبل نگار، پروفیسر انور پاشا، پروفیسر محمد کاظم کی ڈرامے سے متعلق اہم تحریریں شامل ہیں۔ ابتدا میں فکشن تنقید کو سمجھانے کے لئے بھی قدوس جاوید، ارتضیٰ کریم اور عبد الرب جیسے ناقدین کے مضامین شائع کئے ہیں۔ ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے تقریباً ہر زمرے میں اپنا مضمون بھی شامل کیا ہے۔

''اردو فکشن کا مطالعہ کیا جائے تو داستان، ناول، افسانہ، افسانچہ اور ڈرامہ وغیرہ سب اس کے دائرے میں سمٹتے نظر آتے ہیں۔ داستان، ناول اور افسانہ میں کہانی بیان کی جاتی ہے۔ اس میں کسی بھی کہانی کو فنکارانہ انداز میں پیش کر کے قارئین کے ذہنی تسکین کے سامان فراہم کئے جاتے ہیں۔ چاہے داستان ہو یا ناول، افسانہ ہو یا افسانچہ، فنی اعتبار

سے سب کا مقصد ایک ہی ہے مگر ہیئت، تکنیک کے اعتبار سے ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ تینوں اصناف ادب (داستان، ناول، افسانہ) ارتقاء کی مختلف کڑیوں کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ داستان کی ترقی یافتہ شکل کو ناول کہتے ہیں۔ ناول کی ترقی یافتہ شکل افسانہ ہے اور افسانے کے بعد افسانچہ کو افسانوی ادب میں ایک نئی صنف کے بطور تسلیم کیا جارہا ہے۔'' (اردو فکشن تنقید، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، مقدمہ، ص۔)

☆''جہانِ افسانہ'' ڈاکٹر ریاض توحیدی کی اہم تنقیدی کتاب ہے۔ ریاض توحیدی کا نام نوجوان ناقدین میں شامل ہے۔ وہ افسانہ تخلیق بھی کرتے ہیں اور افسانہ ناول کی تنقید بھی۔ اس سے قبل آپ کی فکشن تنقید پر اہم کتب ''معاصر اردو افسانہ۔ جلد اوّل'' ۲۰۱۸ میں اور اسی کی جلد دوم ۲۰۲۱ میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہی نہیں یہ کتاب پاکستان میں بھی چھپ چکی ہے۔ اس میں انہوں نے اردو افسانہ تنقید کی باریکیوں پر خاصی بحث کی ہے، ساتھ ہی بہت سے افسانوں کے تجزیے کئے ہیں۔

''جہانِ افسانہ'' کتاب کو ڈاکٹر ریاض نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں ۲۷ مضامین شامل ہیں۔ ان میں افسانے کی تاریخ، تکنیک، مختلف قسمیں اور معروف افسانہ نگاروں کی افسانہ نگاری کا تجزیہ شامل ہے۔ اس حصے میں پریم چند، منٹو، کرشن چندر، انتظار حسین، بلراج مین را، سریندر پرکاش سے لے کر سید محمد اشرف اور خالد جاوید تک افسانہ نگار شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں اردو کے معروف افسانوں کے تجزیے جیسے فوٹو گرافر (قرۃ العین حیدر) نیم پلیٹ (طارق چھتاری) شمال کی جنگ (نعیم بیگ) سانڈ (غضنفر) چوتھا فنکار (شبیر احمد) وغیرہ شامل ہیں۔ تیسرے حصے میں ریاض توحیدی کی تنقید پر دو مضامین اور سوانحی کوائف شامل ہیں۔

''میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی معیاری تخلیق کے مطالعہ کے بعد اس پر لکھنے کے لئے توقف اور اظہار (Pause and Reflect) کا طریقہ اپنانا چاہئے تاکہ پہلے تخلیق کی فنی و فکری اور اسلوبیاتی جہات سمجھ میں آئیں، اس کے بعد تنقیدی و توضیحی کام شروع کیا جائے

نہ کہ جلد بازی میں سطحی قسم کی تفہیم پیش کی جائے۔ کیونکہ کسی بھی معیاری تخلیق کے اسلوب اور اس کے بعد اس کی تکنیکی وفنی اور فکری وموضوعاتی جہات ہی اس کا تخلیقی وفنی منظر نامہ کہلاتا ہے اور اسی تخلیقی منظر نامے کا تجزیہ کرنا یا جائزہ لینا ایک نقاد کا منصب ہوتا ہے۔''

(جہانِ افسانہ، ریاض توحیدی، ص۔ ۱۵)

☆''منٹو کے نمائندہ کردار'' ڈاکٹر نعیم صدیقی امروہوی کی کتاب ہے جو ان کا پی ایچ۔ڈی کے لئے لکھا گیا مقالہ ہے۔ یوں بھی یہ مصنف کی پہلی کاوش ہے۔ انہوں نے کھل کر منٹو کے کرداروں پر بحث کی ہے۔ منٹو ہماری افسانوی روایت کا پریم چند کے بعد سب سے بڑا، گہرا اور اہم افسانہ نگار ہے۔ وہ تاریکیوں کے بطن سے اجالا اور سفید پوش افراد کے سیاہ قلب کو اجاگر کرنے کا ماہر ہے۔ ڈاکٹر نعیم صدیقی نے اپنی اس کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب انہوں نے ''اردو افسانہ اور منٹو کے تعلق سے بحث کی ہے۔ دوسرے باب میں ''منٹو کی کردار نگاری'' کا تجزیہ کیا ہے۔ اس باب میں انہوں نے منٹو اہم کرداروں پر روشنی ڈالی ہے۔ آگے کے ابواب میں انہوں نے منٹو کے مرد اور عورت کرداروں کی اہمیت، افادیت، ان کے عمل اور ردّعمل کو خوب متھا ہے۔ آخری باب میں منٹو کی انفرادیت کو ثابت کیا ہے۔ اس کتاب پر پروفیسر شارب ردولوی کا پیش لفظ بھی شامل ہے۔ کل ملا کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب منٹو شناسی کے نئے در وا کرتی ہے۔

☆''اردو فکشن: تفہیم و تجزیہ'' ڈاکٹر ابراہیم افسر کی تنقیدی کتاب ہے۔ ابراہیم افسر موجودہ وقت کے اہم محقق و ناقد مانے جاتے ہیں، رشید حسن خاں اور احمد فراز پر تو ان کا اختصاص ہے۔ ان کی درجنوں کتابیں منظر عام پر آ کر داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ہندوستان پاکستان کے معیاری رسائل و جرائد میں آپ کے تحقیقی و تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

''اردو فکشن: تفہیم و تجزیہ'' میں انہوں نے مختلف افسانہ نگاروں اور فکشن ناقدین کی تحاریر پر مضامین سپردِ قلم کئے ہیں۔ دھنورا، غالب، جے این یو کمرہ نمبر ۲۵۹ لفظوں کا

لہو، جیسے ناول، ستیہ پال آنند، بانو قدسیہ، ہیرانند سوز، طارق جمیلی، نگار عظیم، شائستہ فاخری ،احمد رشید، محمد مستمر، حنیف خانتو صیف بریلوی جیسے افسانہ نگار، صادق، ارتضٰی کریم جیسے ناقد اور انتظار حسین جیسے فکشن نگار پر انہوں نے خوب لکھا ہے۔

''اس موقع پر یہ انکشاف کرتا چگوں کہ ابراہیم افسر کی تحقیق وتنقید کا دائرہ کار صرف رشید حسن خاں کی ذات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اور سابقہ عہد کے تخلیق کاروں کی تخلیقات پر بھی بڑی محنت، لگن، جستجو، غور وخوض اور انہماک وادراک کے ساتھ لکھتے رہتے ہیں۔ زیر نظر کتاب ''اردو فکشن: تفہیم وتجزیہ'' ان کی فکشن تنقید کا اولین مجموعہ ہے جس میں ۲۰ رتنقیدی مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے دو مضمون بالترتیب ''ارتضٰی کریم کی تنقید فہمی: عجائب القصص کے تناظر میں'' اور ''صادق کی فکشن تنقید کا جائزہ'' منفرد نوعیت کے ہیں۔ یعنی ان مضامین کا تعلق ''تنقید بر تنقید'' سے ہے جب کہ تمام مضامین فکشن کی کسی نہ کسی صنف سے تعلق رکھتے ہیں۔''

(فکشن فہمی کا نیا استعارہ، محمد مستمر، ص۔)

☆''محمد علیم اسماعیل بحیثیت افسانہ نگار'' فردوس انجم کی مرتب کردہ کتاب ہے ۔علیم اسماعیل ابھرتے ہوئے افسانہ نگار اور افسانچہ نگار ہیں، ساتھ ہی ان کی تنقیدی کتب بھی سامنے آچکی ہیں۔ فردوس انجم ادب کی اچھی طالبہ ہیں اور پی ایچ۔ڈی کر رہی ہیں ۔اس سے قبل ان کی ایک کتاب ''مقالاتِ شبلی: تعارف وتبصرہ'' آچکی ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں انہوں علیم اسماعیل کے افسانوی مجموعے ''الجھن'' پر ۹ مضامین شامل کئے ہیں۔ دوسرے حصے میں علیم اسماعیل کا افسانوی مجموعہ ''رنجش'' پر تحریر کردہ دس مضامیں شامل کئے ہیں اور آخر میں معروف قلم کاروں کے تاثرات کتاب میں جمع کئے گئے ہیں۔

☆'' ڈاکٹر ریاض توحیدی: تخلیقی وتنقیدی جہات'' ڈاکٹر فیصل کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ اس سے قبل بھی ڈاکٹر فیصل کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں خاص کر وارث

علوی پر ان کی کئی کتابیں مشہور ہیں۔دوسری طرف ریاض توحیدی بھی کشمیر کے بانکے ناقداور منفرد افسانہ نگار ہیں۔یہ کتاب دراصل ان کے کاموں کا اعتراف ہے۔ڈاکٹر فیصل نے اس کتاب میں ریاض توحیدی کے فن اور شخصیت پر ۳۷ مضامین، دو انٹرویو ز، پانچ انگریزی میں مضامین، ریاض توحیدی کی نمائندہ تحاریر(افسانے ،تنقیدی مضامین،سماجی واصلاحی مضامین اور شاعری) شامل کی ہیں۔

☆''اردو فکشن: ایک نا تمام قصہ'' جلد اول،محمد علیم اسماعیل کی تنقیدی کتاب ہے۔علیم اسماعیل نئی نسل کے ابھرتے ہوئے ناقد اور فکشن نگار ہیں۔ان کی اس سے قبل بھی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔اس کتاب میں انہوں نے افسانہ، ناول اور اور افسانچے پر مضامین قلمبند کئے ہیں۔کچھ فکشن کی شخصیات پر بھی ان کی تحریریں ہیں۔افسانہ نگاروں کے بھی دو زمرے بنائے ہیں۔ایک زمرے میں پرانے یعنی ۷۰ کے بعد کے افسانہ نگار ہیں ۔مثلاً سلام بن رزاق ،بیگ احساس ،سید محمد اشرف ،نورالحسنین، ذکیہ مشہدی، مشرف عالم ذوقی وغیرہ اور دوسرے زمرے میں وسیم عقیل شاہ، ذاکر فیضی، دائم انصاری ،حمیرا عالیہ، ارشد منیم وغیرہ نئے افسانہ نگار شامل ہیں۔انہوں نے کئی افسانوں ،سریندر پرکاش کا ''قلقارمس''، بشیر مالیر کوٹلوی کا ''با مشقت''، تنویر اختر رومانی کا'' بھروسہ'' وغیرہ کے تجزیے بھی کئے ہیں۔ساتھ ہی افسانچے کے اہم ناقدین اور تخلیق کاروں پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

☆''اردو ناول کی تین صدی'' ڈاکٹر مرتضیٰ کی کتاب ہے۔ڈاکٹر مرتضیٰ کی اس قبل بھی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔اس کتاب میں انہوں ناول کے ابتدائی دور اور ناول کی تعریف سے بحث کی ہے۔ساتھ ہی انہوں نے ڈپٹی نذیر احمد، رشیدۃ النساء بیگم ،عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا، نذر سجاد حیدر، پریم چند، عصمت چغتائی ،کرشن چندر، جیلانی بانو، قرۃ العین حیدر ،عبد اللہ حسین ،ساجدہ زیدی ،الیاس احمد گدی ،ترنم ریاض، پیغام آفاقی اور مشرف عالم ذوقی کی ناول نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ویسے اس کتاب میں رتن

ناتھ سرشار، رضیہ سجاد، شوکت تھانوی، ممتاز مفتی، انتظار حسین، جوگیندر پال، قاضی عبدالستار، غضنفر، سید محمد اشرف، نورالحسنین، شائستہ فاخری، اطہر بیگ، خالد جاوید کو بھی ہونا چاہیے۔

☆''تفہیم وتجزیہ (احمد رشید کے علامتی افسانے)'' ڈاکٹر قدسیہ بانو کی کتاب ہے۔احمد رشید ہمارے عصر کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ان کے کئی افسانوی مجموعے آچکے ہیں۔اس کتاب میں قدسیہ بانو نے ان کے منتخب افسانوں کہانی کہتی ہے، سراب، وہ اور پرندہ، پیشن گوئی، بن باس کے بعد، صدیوں پر پھیلی کہانی، وہ باریش انسان، ٹوٹی زمین کے بکھرے مکیں، کرما اور دوسال بعد کا اصل ٹیکسٹ اور تجزیے پیش کئے ہیں۔ساتھ ہی ڈاکٹر محبوب اصغر کا احمد رشید سے ایک انٹرویو شامل کیا ہے۔کہا جا سکتا ہے کہ احمد رشید صاحب کی زندگی اور فن کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

''زیر نظر کتاب میں احمد رشید کے فنی نظام پر گفتگو کے علی الرغم ان کے دس افسانوں کا تفہیم وتجزیہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔یہ افسانے ان کے بہترین افسانوں کا انتخاب ہے نہ ہی فنی اعتبار سے انہیں کوئی امتیازی درجہ دیا جا سکتا ہے ان کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ اسلوبی اور تکنیکی اعتبار سے دیگر افسانوں سے مختلف ہیں جن کی بدولت انہیں جدت پسند افسانہ نگاروں کی صف میں کھڑا کیا جاتا ہے۔'' (تفہیم وتجزیہ، قدسیہ بانو، ص۔۶۱)

☆''لوگ کیا کہیں گے'' کتاب کی مرتبہ ڈاکٹر نگار عظیم ہیں۔نگار عظیم ۷۰ کی دہائی کی ایک معروف افسانہ نگار ہیں۔ان کی اس سے قبل بھی کئی کتابیں اور مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔نگار عظیم ''بنات'' کی صدر بھی ہیں۔سینکڑوں شاعرات اور ادیبائیں اس بین الاقوامی نسائی تنظیم سے جڑی ہیں۔اور یہ سب بنات کے وہاٹس گروپ پر سرگرم رہتی ہیں۔''لوگ کیا کہیں گے'' اپنے گروپ پر خواتین کا اس عنوان کے تحت لکھی گئی تحریروں کا مجموعہ ہے۔اس میں بہت سے خاکے اور کہانیاں ہیں، بعض دل کو چھو جاتی ہیں۔خاص کر لوگ کیا کہیں گے (قمر جمالی، نعیمہ جعفری پاشا، شبینہ فرشوری) لوگوں کو

کہنے دو(آصف اظہار علی) کچھ جگ بیتی کچھ آپ بیتی (عذرا نقوی)زندگی کا ایک ورق(آمنہ تحسین)عشق خوش سودائے ما(روبینہ شبنم)میری امی کی شادی(شہانہ اقبال)کلبلاہٹ(غزالہ قمر) گمراہی (رفعت فرزانہ) حوصلہ(حسن آرا) بھرم (تسنیم کوثر)ہم سے کیا بھول ہوئی(ترنم جہاں شبنم)سفر جاری ہے (رافعہ ولی)زندگی کے رنگ(فرخندہ ضمیر)وغیرہ نے اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

''بھوپال سے فون آیا حامد صاحب سے کہئے فلاں روز مہمانوں کو لینے ایر پورٹ چلے جائیں۔ حامد صاحب آفس کی طرف سے ٹور پر مدراس گئے ہوئے تھے۔ میں نے برجستہ جواب دے دیا، میں چلی جاؤں گی وہ تو ٹور پر گئے ہیں۔''

آواز آئی اچھا آپ دہلی والی ہوگئیں۔

میں نے کہا جی الحمدللہ۔ بھوپال آکر پھر بھوپال والی ہو جاؤں گی۔ مگر جب میں بھوپال واپس آئی، پل پر سے پانی کئی رنگ بدل کر بہہ چکا تھا۔

لوگ کیا کہیں گے کا ڈر کسی حد تک قصہ پارینہ ہو گیا، اب کسی کو کسی کی پرواہ نہیں۔ بس اللہ کا بھرسہ کافی ہے۔ (لوگ کیا کہیں گے، قمر جمالی ص ۷۲)

☆''قصہ دراصل یہ ہے'' ڈاکٹر جاوید انور کی کتاب ہے۔ جاوید انور اس سے قبل بھی کئی کتب دے چکے ہیں۔ خاص کر وہ جموں کشمیر کے تخلیق کاروں پر کافی لکھ چکے ہیں۔ یہ کتاب وحشی سعید کے ''قصہ یہ ہے سریز'' کے دس افسانوں کے تجزیوں پر مشتمل ہے۔ وحشی سعید کا کمال ہے کہ انہوں ایک ہی سریز کے دس افسانے تخلیق کئے۔ جاوید انور کا بھی کمال ہے سبھی افسانوں کے تجزیے، بین العلومی تنقید کی روشنی میں کئے۔ یہ جاوید انور کا مخصوص شعبہ ہے اور وہ اس کے ماہر ہیں۔ اس کتاب کی افادیت اور بڑھ جاتی ہے کہ اس میں وحشی سعید کے افسانے اور جاوید انور کے تجزیے شامل ہیں۔

''قصہ دراصل یہ ہے(ا) غائب راوی کے صیغے میں بیان کردہ ایک مرکزی کردار کی ایسی روداد ہے جس کا بچپن سے لے کر جوانی اور موت تک کا قصہ ہے۔ مرکزی کردار ''وہ''

یہاں ایک ایسی تقدیر والے فرد کا استعارہ ہے جس کے لئے زندگی صرف محرومیوں اور مایوسیوں کا نام ہے۔ان محرومیوں اور مایوسیوں سے کچھ پلوں کے لئے نجات پانے کے لئے وہ گلی کا نکڑ جہاں اسے کچھ سکون یا پھر یوں کہیں کہ کچھ پلوں کے لئے دل کا بہلاوا میسر آتا تھا دراصل کبھی کبھی یا کثر اس کے ماضی کو کرید کر اسے مزید غم واندوہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور اس طرح یہ بہلاوے مزید ذہنی اور جسمانی اذیت کی علامت بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔'' (''قصہ دراصل یہ ہے، جاوید انور، ص۔۱۰)

''افسانچہ اور افسانچہ نگار'' اسلم جمشید پوری کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔اس میں افسانچے کی اہمیت وافادیت اور افسانچوں کے تجزیے شامل ہیں۔

☆''جال'' ڈاکٹر یاسمین اختر کے افسانچوں کا مجموعہ ہے۔اس سے قبل بھی یاسمین اختر کے کئی ناولٹس، افسانوی مجموعے، تنقیدی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ان کے افسانطوں کا بھی ایک مجموعہ''' لمحے'' ۲۰۲۲ میں آکر مقبول ہو چکا ہے۔ان کے اس مجموعے میں ۹۰ افسانچے شامل ہیں۔ان میں سے بعض تو بہت اچھے ہیں۔کچھ بہتر ہیں۔افسانچوں کی زبان اچھی ہے۔جال، کردار، سنک، نا سمجھ، پہچان، امانت، دکھڑا، معذور، شکار، جل بن مچھلی وغیرہ نے متاثر کیا۔ سنک (یاسمین اختر)

''میرے ایک دوست کو نہ جانے کیا سنک سوار ہوئی کہ اچھی خاصی ملازمت چھوڑ کر، وہ کمپنی جوائن کر لی جہاں ستر فی صد لڑکیاں کام کرتی ہیں۔''

ادبِ اطفال:

اس سال ادبِ اطفال کی بھی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔بچوں کے لئے بارہ کہانیاں (نذیر فتح پوری) تین ستارہ منزل (جہانگیر انس) سانچ کو آنچ نہیں (شیخ رحمٰن اکولوی) موبائل کھلونا نہیں (حبیب سیفی) بلیک بورڈ (حبیب سیفی) ٹیپو کی کہانیاں (سراج عظیم) وغیرہ۔''سانچ کو آنچ نہیں'' ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی کی بچوں کے لئے طبع زاد کہانیوں کا مجموعہ ہے۔اس سے قبل بھی شیخ رحمٰن کی بچوں کے لئے کتابیں ''سنو بچّو!'' ۱۹۹۰ میں اور ''پیاری

پیاری کہانیاں'' ۲۰۰۶ میں شائع ہوئیں۔اس کتاب میں ۱۶ کہانیاں شامل ہیں۔یہ سبھی بچوں کے مزاج،عمر اور کلاس کے اعتبار سے ہیں۔ان سے بچوں میں اچھے اخلاق و کردار کا سبق ہے۔کتاب کی ٹائٹل کہانی 'سانچ کو آنچ نہیں' ہے۔اس کہانی میں ایک ایماندار بوڑھی عورت کا قصہ ہے۔وہ سوت کات کر بیچتی ہے اور اپنا پیٹ پالتی ہے۔کسی سے مانگتی نہیں۔یہ بات کچھ لوگوں کو برداشت نہیں تھی۔اس پر ایک سوت خریدنے والے نے الزام لگایا کہ ایک ہی طرح کا سوت وہ الگ الگ داموں میں بیچتی ہے۔اس نے بادشاہ سے شکایت کردی۔بوڑھی عورت نے بھرے دربار میں بادشاہ کے سامنے کہا کہ میں نے اس کو جو سوت مہنگا بیچا،وہ گھر کے چراغ میں کاتا تھا اور دوسرے کا سوت میں سرکاری قندیل کی روشنی میں کاتا،اس لئے سستا دیا۔الزام لگانے والے اپنا سا منھ لے کر رہ گئے ۔ایک اچھی اور سبق آموز کہانی ہے۔

☆''تین ستارہ منزل'' جہانگیر انس کی بچوں کی کہانیوں کی کتاب ہے۔اس سے پہلے بھی جہانگیر انس نے ادبِ اطفال تخلیق کیا ہے۔''کہانیاں''اور''چشمے کی تلاش'' ان کی اس سلسلے کی مقبول کتابیں ہیں۔اس میں مصنف کی ۲۰ کہانیاں شامل ہیں۔تین مسافر،سرپنچ کی ذہانت،قیمتی وقت،آہ!وہ مرگئی،ٹھگوں کا بادشاہ،زمانہ بدل گیا ہے،نمک حرام یا حلال،زیرو یا ہیرو وغیرہ کہانیاں متاثر کرتی ہیں۔ان کے مطالعے سے بچوں کے اندر اچھے اخلاق پیدا ہوں گے۔

☆''بچوں کے لئے بارہ کہانیاں'' موجودہ وقت کے بڑے ادیب نذیر فتح پوری کی ہیں۔نذیر فتح پوری زود گو فنکار ہیں۔انہوں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ایک اندازے کے مطابق وہ اب تک ۱۰۰ سے زائد کتابیں لکھ چکے ہیں۔شاید ہی کوئی صنف ہوگی جس میں نذیر فتح پوری نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ادبِ اطفال پر بھی ان کی تقریباً ایک درجن کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔اس کتاب میں بارہ کہانیاں ایک نذیر فتح پوری پر عاکف خان کا مضمون اور ان سے لئے گئے ڈاکٹر غضنفر اقبال سمیت دو انٹرویو شامل ہیں۔یہ انٹرویو

بھی ادبِ اطفال میں ان کی خدمات کے حوالے سے ہیں منشی پریم چند، کہانی بڑوں کی ،آخری کہانی، کہانی کار، سونے کی چڑیا، ماسٹر صاحب، انصاف کا راج ، اچھی کہانیاں ہیں۔

والد صاحب کہنے لگے:

''ہاں بیٹا! منشی پریم چند کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ وہ غریبوں اور کسانوں کے ہمدرد تھے۔ منشی پریم چند نے ان لوگوں کا دکھ درد اور مسائل دنیا کے سامنے رکھے۔ انھوں نے بھوکے پیاسے دیہاتیوں کے حالات بھی اپنے قلم کے ذریعے بیان کر کے دنیا کو بتایا۔'' (منشی پریم چند، نذیر فتح پوری، ص۔ ۱۴)

خودنوشت سوانح: نمی رقصم (ابرار رحمانی) یہ میں ہوں (ف۔س۔اعجاز) افسانہ بنے گا کل (عبدالصمد) صدائے نحیف (پروفیسر ابوسفیان اصلاحی) وغیرہ۔

☆اس سال کئی معروف خودنوشت سوانح شائع ہوئی ہیں۔ ابھی گذشتہ برس شائع خودنوشت ''سر بازاری رقصم'' (پروفیسر محمد حسن) کا شور باقی تھا۔ بلکہ پروفیسر محمد حسن کی خودنوشت نے اردو ادب خاصی گرمی پیدا کی تھی۔ اس میں نہ صرف محمد حسن کے گذرے شب و روز کا تفصیلی ذکر تھا بلکہ ان کی جنسی فتوحات کا اچھا خاصا چٹکارے بھرا ذکر موجود تھا۔ اس سوانح نے دو بڑے کام کئے۔ ایک تو خودنوشت سوانح کے اصول و ضوابط کو جھنوڑا۔ دوسرے کئی لوگوں کو سوانح لکھنے کی ترغیب دی۔ کئی لوگوں نے تو یہاں کہہ دیا کہ یہ محمد حسن کی تحریر ہی نہیں۔ ان کی بنی ہوئی ادبی شبیہ کو مسخ کرنے کی ایک مذموم حرکت ہے۔ لیکن ان کے ایک شاگرد ابرار رحمانی نے اس کے جواب میں اپنی سوانح تحریر کی اور اس کا نام محمد حسن کی سوانح کے نام کی نفی کرتے ہوئے ''نمی رقصم'' رکھا۔ تقریباً ۴۰۰ صفحات اس خودنوشت میں ابرار رحمانی نے خاندان، بچپن، تعلیم، ادبی ماحول، ادبی تحریریں، شادی، ملازمت کے نشیب و فراز، مختلف اور مزیدار قصے، بزرگانِ ادب کے تذکرے، اردو کے بڑے اور معروف لوگوں سے تعلقات کا بیان، ہم

عصر ادیبوں کا ساتھ، معروف اور مشہور ادبا و شعرا کا ذکر، ہم کار لوگوں سے خود کے تعلق کا تفصیلی بکھان وغیرہ کو سوانحی رنگ دیا ہے۔ انہوں اس چھ باب قائم کئے ہیں۔ ابواب سے قبل ''احوالِ واقعی'' کے تحت انہوں نے مختلف، دلچسپ اور فکر انگیز باتیں تحریر کی ہیں۔

☆''صدائے نحیف'' پروفیسر ابو سفیان اصلاحی کی سوانح ہے۔ تقریباً ۴۵۰ صفحات پر پھیلی یہ خودنوشت سوانح بہت دلچسپ اور انوکھی ہے۔ سوانح نگار کا تعلق شعبہء عربی سے ہے۔ یہی سبب ہے کہ سوانح کا انداز بھی جدا ہے۔ اپنی خودنوشت میں مصنف نے والدین، خالہ، بھائی، بھابھی، چھوٹے بڑوں کے حوالے سے اپنے بچپن سے لے کر جوانی اور ادبی فتوحات کا مفصل ذکر کیا ہے۔ لاہور، علی گڈھ، لکھنو اور اعظم گڈھ کا بیان ہے۔ زبان خاصی معیاری ہے۔ واقعات کے بیان دلسپی سے خالی نہیں۔ مصنف نے پوری کتاب کو چھ ذیلی عنوانات کے تحت تحریر کیا ہے۔ آخری حصے میں مصنف سے بہت معروف صحافی اور مدیران کے تفصیلی انٹرویوز شامل ہیں۔ ابو سفیان اصلاحی کی زندگی اور ان کارناموں کو جاننے کے یہ کتاب بے حد ضروری ہے۔

☆''یہ میں ہوں'' ف س اعجاز کی آپ بیتی ہے۔ مگر انہوں اپنے بیان اور انداز سے اسے جگ بیتی بنا دیا ہے۔ آپ اسے پڑھتے جائیں اور مصنف کی جادو بیانی میں گرفتار ہوتے جائیں۔ دس اعجاز کے بیان میں دلچسپی کے عناصر تو ہیں ہی ساتھ ان کی زبان میں خاص کشش ہے، جو قاری کو اپنے سحر میں قید کر لیتی ہے۔

مصنف نے ۲۶۴ صفحے کی اس کتاب میں خاندان، والد کی دو شادیاں، بچپن، تعلیم، ادبی دلچسپی، صحافت میں داخلہ، اساتذہ، شادی، ادبی ترقیاں، ترجمے وغیرہ کا تفصیلی بیان کیا ہے۔ ماہنامہ'' انشاء'' کی اشاعت، اس کے خاص نمبر، اپنا معاشقہ، خطوط، مختلف مواقع اور موضوعات پر لکھی نظمیں، ایک تقریر، صحافت اور ترجمہ نگاری کا ذکر ہے۔ اس سوانح کی ایک خوبی اس میں موجود مصنف کی دیگر مشاہیر ادب کے ساتھ بہت سی (بلیک اینڈ وہایٹ مگر واضح) تصاویر ہیں۔ ف س اعجاز کی سوانح پڑھنے کی چیز ہے۔

''بچپن جہاں سے مجھے یاد آتا ہے وہ ہے حویلی حسام الدین حیدر، بلی ماران کا مکان نمبر 1337 جو والد نے کسٹوڈین سے کرائے پر لے رکھا تھا۔ مرزا غالب کے مکان سے تین چار منٹ کی مسافت پر گلی محل سرائے کے پھاٹک کے ٹھیک سامنے ہمارے گھر کا زینہ تھا۔ نچلی منزل پر بلی ماران کے کسی تاجر کا لنولیم اور ریکسن کا گودام تھا۔ پہلی منزل اور چھت ہمارے قبضے میں تھی۔ بڑا کشادہ گھر تھا جس میں ہم کھیل سکتے تھے، اچھل کود مچا سکتے تھے۔ ''ہا۔ ہو'' چلا کر اپنی گونج سن سکتے تھے۔''۔(''یہ میں ہوں'' ف س۔ اعجاز)

☆''فسانہ بنے گا کل'' معروف فکشن نگار عبدالصمد کی سوانح ہے۔ عبدالصمد اردو کے معروف فکشن نگار ہیں ۔ان کے کئی افسانوی مجموعے اور ناول منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انہیں ان کے معروف ناول'' دوگز زمین'' کے لئے ساہتیہ اکادمی انعام بھی مل چکا ہے۔ وہ عصری اردو فکشن کے ایک ستون ہیں۔ ان کی سوانح ایک دلچسپ ناول کی طرح ہے جس میں ان کی زندگی کے نشیب و فراز موجود ہیں۔ مصنف نے اپنی سوانح میں خاندان ،تعلیم اور ملازمت کے ذکر کے بعد اپنے آس کا ماحول ،اردو ادب کی تحریکیں، پٹنہ اور اردگرد کا ادبی ماحول، مختلف ادبی شخصیات، اپنے پہلے ناول'' دوگز زمین'' کی وجہ تخلیق، دیگر ناول، ساہتیہ اکادمی انعام کا ذکر، انگریزی کا شوق، سیاسی منظر نامہ ، بہت سی ادبی شخصیات شمس الرحمٰن فاروقی ،کلام حیدرری، عبدالمغنی، فخر الدین عارفی، علی احمد فاطمی ،ابو الکلا م قاسمی، محسن رضا رضوی ،شاہد احمد شعیب، وہاب اشرفی ،عالم خورشید، خورشید اکبر، ارندر ناتھ چودھری، رام لعل، جوگیندر پال، بلراج کومل، نند کشور وکرم ،وغیرہ کا خود سے تعلق تحریر کیا ہے۔

''ماہنامہ 'شب خون' نے اس خوشگوار تبدیلی کو روشن کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ نیت اور خلوص کی حد تک تو معاملہ ٹھیک ٹھاک رہا، مگر بعد میں جدیدیت کے نام پر اوٹ پٹانگ اور معنی و مطلب سے عاری چیزیں سامنے آنے لگیں۔ اگر چہ اس افراتفری میں بھی فکشن اور شاعری کے چند بہترین نمونے سامنے ضرور آئے۔ افسوس اس کا ہے کہ جس

طرح کا ماحول بن گیا تھا، اس کی دھند میں اچھی تحریروں کا ذکر کم ہوتا تھا اور بے معنی چیزوں کا زیادہ۔'' (فسانہ بنے گا کل، عبدالصمد۔ص۔ ۱۳)

رسائل کے خاص نمبر: ☆رسالہ ''عالمی جائزہ'' (مدیر، اے رحمٰن) کا ابنِ صفی نمبر بڑی شان وشوکت سے منظرِ عام پر آیا۔ بڑے سائز کے ۶۵۰ صفحات پر مشتمل یہ نمبر ابنِ صفی کے تمام گوشوں (حتی المقدور) پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ اس کا مطالعہ ابنِ صفی فہمی کے لئے بہت ضروری ہے۔ مدیر نے اسے تیار کرنے میں کافی جدوجہد اور لگن سے کام لیا ہے۔ اس شمارے میں ابنِ صفی کی خود کے بارے میں تحریریں، ان کے خاندان سے متعلق تخلیقات، ان سے کئی انٹرویوز، جاسوسی ادب کے مختلف پہلو، ابنِ صفی کے نقّال، ابنِ صفی کا پراسرار ذہن، سائنسی بصیرت، اہم کردار فریدی اور عمران، اہم ناولوں کے تجزیے، اردو ادب میں ابنِ صفی کا مقام ومرتبہ، ابنِ صفی کے ناولوں کے تراجم، بعد کے ادب پر اثرات، کرداروں کے موازنے، اور بہت کچھ۔۔ اس خاص نمبر کے لئے ادارہ مبارکباد کا مستحق ہے۔

☆سہ ماہی ''سیما'' (مدیر، پروفیسر صغیر افراہیم) کا ''علی گڈھ میں معاصر فکشن ۔ ۱۹۷۴ سے ۲۰۲۴ تک'' شائع ہوا۔ رسالہ سیما ابھی نیا ہے مگر اس نے بہت جلد اپنی پہچان بنا لی ہے۔ معیاری تخلیقات اور بہترین پیش کش اس کی شناخت ہے۔ ۴۷۲ صفحات کے موجودہ نمبر میں علی گڈھ کے فکشن اور فکشن تنقید (مذکورہ مدت) کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس میں خاص کر سید محمد اشرف، طارق چھتاری، غضنفر، غیاث الرحمٰن سید، احمد رشید، صغیر افراہیم، محمد غیاث الدین، نجمہ محمود، رفعت بلگرامی، فاطمہ زہرا بلگرامی، شبیہ زہرا حسینی، عفت آرا، شہناز ہاشمی (شہناز کنول) فہمیدہ، ف ع خان، پیغام آفاقی، انجمن آرا انجم، ابنِ کنول، مہر الٰہی ندیم، انجم قدوائی، نسترن احسن فتیحی، ابوبکر عباد، عذرا نقوی، آسف اظہار علی، نعیمہ جعفری پاشا، آفتاب عالم نجمی، شہناز رحمٰن، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار، توصیف بریلوی، وفا نقوی، اکرم شروانی پر مضامین (یا

ان کے مضامین)اس شمارے کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ ایک بڑا کام ہے ۔توصیف بریلوی ،محمد حنیف خان اور افشاں ملک پر بھی مضامین ہوتے ۔مگر مدیر کی پریشانیاں ایک مدیر ہی جان سکتا ہے۔کتنا مشکل ہوتا ہے موضوع کا احاطہ کرنا۔

☆ دو ماہی ''عالمی افسانہ نما'' (مدیر، محمود شاہد) کا ادب اطفال نمبر سامنے آیا۔دراصل، عالمی افسانہ نما، افسانچوں کا اردو دنیا میں واحد رسالہ ہے۔یہ افسانچے کے فروغ میں ہمہ وقت اپنی خدمات دے رہا ہے۔مختلف زاویے سے افسانچے لکھوانے کے عمل میں مصروف ہے۔ادبِ اطفال نمبر میں بھی بچوں کے لئے افسانچے ہیں۔ان کے مطالعے سے بچوں میں ذہنی نشونما اور اچھے اخلاق و کردار کا فروغ ہوتا ہے۔نمبر میں افسانچے پر مضامین اور ڈھیروں افسانچے موجود ہیں۔

غضنفر، عذرا نقوی، رونق جمال، محمد طیب خرادی، خورشید حیات، حشمت کمال پاشا، ریاض توحیدی، ارشد منیم، فرخندہ ضمیر، سراج فاروقی، نفیسہ سلطانہ انا محمود شاہد جیسے فنکاروں کے تقریباً ۹۰ افسانچے موجود ہیں۔

☆ سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائمز'' (مدیر، منصور خوشتر) نے انیس رفیع جیسے بڑے فنکار کے انتقال کے بعد ایک گوشہ شائع کیا۔دربھنگہ ٹائمز، اردو رسائل میں اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔کسی ادیب کی یاد میں گوشہ شائع کرنے کے لئے بھی مشہور ہے۔انیس رفیع کے اس گوشے میں آٹھ مضامین اور دو انٹرویو شامل ہیں۔مقصود دانش، سید احمد قادری ،احمد صغیر، محفوظ عالم، فخر الدین عارفی، منصور خوشتر، غالب نشتر وغیرہ کے مضامین گوشے میں شامل ہیں۔

☆ سہ ماہی ''عالمی انتساب''، سیفی سرونجی کی ادارت میں مستقل شائع ہونے والا رسالہ ہے۔یہ رسالہ اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔نوجوان ادباء و شعراء کی ہمت افزائی اس کا برسوں سے عمل رہا ہے۔انتساب اپنے خاص نمبروں کے لئے بھی مشہور ہے۔ابھی سرحد پار کی تخلیقات کے نمبر شائع کئے ہیں۔اور اب ''۷۰ پار کے افسانہ نگار'' گوشہ شائع

کر کے ادب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔اس شمارے میں ۲۰ افسانہ نگاروں کے افسانے شامل ہیں۔جن میں بشیر مالیر کوٹلوی، طارق چھتاری، حمید سہروردی، نورالحسنین، ذکیہ مشہدی، غضنفر، قمر جمالی، فیروز عابد، علی امام، نور شاہ، کیول دھیر، ف س اعجاز، عشرت ظہیر جیسے منجھے ہوئے افسانہ نگاروں کے افسانے ہیں۔

☆ کہانی فروش، تصنیف حیدر کا ناول ہے۔تصنیف حیدر کے افسانے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ان میں الگ قسم کی دنیا ہوتی ہے، جس میں گوشت پوشت کے انسان تو ہوتے ہی ہیں، ساتھ ہی زمینی مسائل اور الجھنیں ہوتی ہیں جو ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں۔یہ تصنیف کا پہلا ناول ہے۔انہوں نے بہت ہی الگ موضوع لیا ہے۔اس ناول میں انہوں نے مزاروں، قبروں اور بناوٹی پیر فقیروں کی عجیب وغریب دنیا پیش کی ہے۔بھوت اتارنے کا عمل، مزار پر عورتوں کا ہجوم، منتیں، لڑکیوں کے ساتھ اوپری سایہ اتارنے کے نام پر ہونے والی جنسی زیادتیاں، وہ سب ہے جو ہم زندگی میں دیکھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ماں کا اپنے بیٹے کے ساتھ وصل کی شب گذارنا، مجاور کا عجیب و غریب روپ ظاہر کرنا سب کچھ ہے۔سارا، مجاور اور صیغہء واحد متکلم اس ناول کے اہم کردار ہیں۔ناول ایک اقتباس آپ بھی دیکھیں۔:

''وہ ساتویں پردے میں چھپائے اس کریہہ منظر سے بہت دور کسی آسمانی غار میں چھپا بیٹھا تھا۔بادلوں نے ایک دوسرے کی آنکھ پر ہاتھ رکھ دیا، بجلیاں تڑپ تڑپ کر رہ گئیں اور آسمان گہری تاریکی میں خود پر بجلیوں کے نیلے تازیانے برسانے کی کوشش کرنے لگا۔مگر جو ہونا تھا، وہ ہوا۔وصل کی وہ لمبی رات ماں بیٹے کے دلوں کو مزید داغدار کر کے رخصت ہوئی۔'' (کہانی فروش، تصنیف حیدر، ص۔۶۶)

☆☆☆

Mushaf Iqbal Tausifi : Munjamid pur Shor Dariya by Aslam Imadi

(Hyderabad) cell-9966683014

اسلم عمادی (حیدرآباد)

مصحف اقبال توصیفی: منجمد پر شور دریا

اُردو کی نئی شاعری اِس معاملے میں بہت خوش بخت ہے کہ اس کے دامن میں کئی نمائندہ اور قابل ذکر شاعر اپنے اپنے منفرد لب ولہجہ (زبان، ڈکشن اور فکر) کے ساتھ رونق پذیر ہیں۔ یہ شاعر ہندوستان، پاکستان اور دوسرے ممالک میں رہتے ہوئے بھی ایک حد تک اسی فکری لہر سے اِرتباط رکھتے ہیں جو جدید شاعری کی شناخت ہے۔ ایسے ہی ایک اہم شاعر جناب مصحف اقبال توصیفی بھی ہیں۔ ہندو پاک میں جب بھی جدید شاعری کی بات ہوگی تو اِس میں اہم ترین ناموں میں مصحف کا ذکر ضرور آئے گا۔ مصحف نے شاعری کو سراسر اِظہار ذات کے وسیلے کی طرح استعمال کیا ہے وہ اپنی سوچ کی ترسیل کے لیے ارتکاز کے ساتھ ایک مخصوص ڈکشن کو پسند کرتے ہیں اور یہی ڈکشن ان کی شاعری کی پہچان ہے۔ ان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ آپ ایک مانوس سے ماحول میں آ گئے ہیں، جہاں کے سارے کردار کچھ جانے پہچانے سے ہیں لیکن جہاں کے موسم اجنبی اور جداگانہ سے ہیں، یہ تحیر آمیز صورت حال مصحف نے غضب کی فن کارانہ صلاحیت سے پیدا کی ہے۔

مصحف کی شاعری کی اہم ترین قوت ان کی صداقت ہے وہ جذبات کے اظہار کے لیے کوئی غیر معمولی فطری ماحول نہیں گھڑتے بلکہ کچھ حد تک راست طور سے لیکن شاعرانہ تیور سے اپنا اصل مقصود بیان کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں اور غزلیں دونوں ہی اس معاملے میں ان کے ذاتی تجربات، ذاتی شعور اور قریب ترین ماحول سے متعلق ہیں۔

اس لحاظ سے مصحف کی شاعری بنیادی طور پر دونوں ہی فارم (نظم اور غزل) میں اپنی جداگانہ تخصیص رکھنے کے باوجود خلوص اظہار پر مرکوز ہیں۔ پھر بھی دونوں ہی اصناف میں ان کے دو بے حد الگ اور واضح طرز بیان سامنے آئے ہیں۔ جہاں ان کی نظمیں، بیش تر نیم مکالماتی یا خود کلامی یا بیانیہ میں سے کسی ایک لہجہ کو استعمال کرتی ہیں۔ ان کی غزل سراسر شاعرانہ، سہل ممتنع اور راست اور کچھ حد تک روایتی انداز پر مائل ہے۔ ندرت تو ہے لیکن تجربہ اور علامتی اظہار (جو کہ جدید شاعری کا رویہ ہے) کا کم ہی تناسب ملتا ہے۔

ایک اور بات جو مصحف کی شاعری کو ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ عمیق، گنجلک اور مجہول موضوعات سے شاعری کو بوجھل، دور افتادہ یا نارسا بنانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ شاعر آپ سے قریب تر ہے، وہ آپ کا شریک سفر ہے، وہ آپ کو وہ باتیں سناتا ہے جس سے آپ شاید مانوس ہیں لیکن ان کی پرتیں اور ان کی زیریں رو کی نشان دہی بھی کرتا ہے جو آپ کے لیے شاید نئی ہوں۔ کچھ حد تک ناصر کاظمی اور خلیل الرحمن اعظمی نے شاعر کے جس (Role) رول کے بارے میں اشارہ کیا تھا وہی منصب یا رول (زیرک فکر کے امتزاج کے ساتھ) مصحف نے نبھایا ہے۔ ان کی نظمیں متوسط طول کی بلکہ کچھ حد تک مختصر طوالت کی ہوتی ہیں کسی موضوع کے ساتھ دیر تک، دور تک اور تکرار کے ساتھ چلنے سے گریز کیا گیا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ شاعر موضوع کو برتنے کے لیے سطحیں تبدیل کرتا ہوا، پرتیں کھولتا ہوا، زاویے بدلتا ہوا، انحراف یا گریز کرتا ہوا طویل فکری اظہار کی طرف مائل ہو۔ اس کے لیے مختصر لمحہ کا اظہار زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ ایسے ہی کئی مختصر لمحے مل کر طویل زندگی کی آئینہ داری کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے ان کی نظموں میں عام طور سے مکالماتی (بلکہ نیم مکالماتی کہوں تو بہتر ہے) انداز کو منتخب کیا گیا ہے۔ شاعر عموماً اپنے کردار کے تعارف کے لیے اس کے اطراف و اکناف اور احباب سے تعلق و نسبت کو اجاگر کرتا ہے۔ ان نظموں میں کچھ حد تک ایک نامحسوس قسم کی کردار نگاری بھی ملتی ہے۔ یہ کردار بیش تر رائج

الوقت اور ہم عصر (Contemporary) سماج کی تمثیل کی طرح ہیں۔ شاعر اس کردار کو اس کے لب و لہجے اور Approach کے تناظر میں پیش کر کے نئی زندگی کی عکاسی کرنے کی کوشش کرتا ہے یہ عکاسی بالکل صریح اور راست بھی نہیں بلکہ کئی مائل سطحوں سے ہو کر ایک مقصود منظر کو پیش کرتی ہے۔

غزلوں میں جہاں شاعر نے سہل ممتنع طرز بیان کو ترجیح دی ہے وہیں ان کا ہر شعر واضح اکائی کی طرح ایک خاص موضوع کا اظہار ہے۔ شعر کی زبان میں ایک خفیف سی پیاس، ایک غیر متوقع اچانک پن اور محتاط طور پر لفظوں کا انتخاب اور عام طرز سے ہلکا سا اعراض ان کی غزلوں کو جدید غزلوں میں ایک بین شناخت فراہم کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کی سب سے اہم جہت ''غزل'' پن ہے۔ ان کے موضوعات میں ''ہم تم'' کا تذکرہ (کچھ حد تک رومان)، ہم سفری کے تجربات، وقت گزاری کے اشغال اور ذاتی مشاہدات بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ چند اشعار اس ضمن میں:

تو بھی مجھ سے روٹھی تھی　　میں اِک کروٹ لیٹا تھا
محفلوں میں کم نظر آتا ہوں میں　　اپنی تنہائی سے گھبراتا ہوں میں
یہ آئینہ خانہ کیا کروں میں　　میں تجھ کو کہاں رکھوں چھپا کر
ذرہ ذرہ مری لاکھوں آنکھیں　　لمحہ لمحہ ترا جادو ہوتا

میری آنکھوں کے دروازے پر دستک دی
سوتے ہوئے اک غم کو جگایا کس نے؟ تم نے!

بھیڑ تھی کیسی دوکانوں پر!　　کوئی نہ پہنچا اپنے گھر تک!
رات تم نے روشنی کے کھیل میں　　کیوں مرے سائے پہ سایہ رکھ دیا
چار سو میں نے بچھا دیں آنکھیں　　ہر طرف تو تھی اور، نظارے تیرے

مصحف کا الفاظ سے رشتہ خالص طور پر ترسیل کے تناظر میں ہے، وہ لفظ کو ایک آلہ کی طرح (بلکہ ایک زنجیر کی کڑی کی طرح) اِستعمال کرتے ہیں، یہ آلہ سراسر اِکہرا نہیں

ہے۔وہ ہر لفظ کو ایک منتخب سطح سے متشرح کرتے ہیں،کبھی وہ مناظر کو نیم باز حد تک کھولتے ہیں یا کبھی ان میں ایسا رنگ بھر دیتے ہیں جو نئی معنویت بخشے،جس سے ایک غیر عمومی حساس فضا پیدا ہو جاتی ہے ایسی فضا جو ہر غیر مرئی لہر سے اہتزاز انگیز اور مرتعش ہو جاتی ہے۔کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ نجی زندگی کے کسی تجربے کو شاعر وسعت دے کر ایک عالمی تجربہ میں بدل دینا چاہتا ہے اور وہ بھی یوں کہ نجی محسوسات ضائع نہ ہوں۔مصحف کی شعری زبان ان کی نظموں میں بہت حد تک نثری بیانیہ اسلوب میں ہیں جن میں مجید امجد اور اختر الایمان کی نظموں جیسا کھردرا پن ہے۔لب و لہجہ میں پُر فریب لفاظی اور نرم و شیریں تراکیب سے احتراز کیا گیا ہے تاکہ بات حقیقت سے بعید نہ ہو پائے اور اسی ارتکاز سے ترسیل ہو جس کو شاعر مرغوب سمجھے۔نظموں میں ایک عمومی زندگی سے منتخب مناظر اور علامتیں پیش کیے گئے ہیں جو قریب تر محسوس ہوں مثلاً چائے،نکڑ،کافی ہاؤس، گیند،کھلونا،شیو(Shave)،سگریٹ،ریل،کھانے کی میز،ممی پپا،مائیکرو فلم،اسکوٹر وغیرہ۔جیسا کہ میں نے اس سے پہلے ایک مضمون میں اشارہ کیا تھا،مصحف کی نظموں میں وقت ایک اہم رکن ہے، وہ وقت پل پل سے لیکن صدیوں تک ناپتے ہیں۔اس کے علاوہ،وہ تراکیب اور بندشوں میں ایک طویل بیان کو محو اور منجمد کر دیتے ہیں۔

ان کی نظموں میں ذاتی کرب کو کلیدی اہمیت حاصل ہے،فرد کی گرسنگی،دوستوں کے بچھڑنے کا غم،معصوم زندگی سے دور ہو جانے کا الم،رشتوں میں مثبت و منفی تعلق،اظہار و ترسیل کے مسائل اور ایسے ہی کئی اہم موضوعات ہیں جو ان کی نظموں میں خصوصیت سے ملتے ہیں۔مصحف کی نظموں کے ماحول اور کردار دونوں ہی متوسط درجہ کے سماج سے منتخب شدہ ہوتے ہیں، اس لیے آپ کو ان کا کلام پڑھتے ہوئے نامانوسیت کا احساس نہیں ہوتا۔ان کی نظموں کے چند گوشے نمونتاً پیش ہیں:

''تم بڑے چالاک ہو
اور سفاک بھی

تم چاہتے ہو
میں اپنے ہونٹوں کی سیپیاں ضرور کھولوں
اپنے سینے کے راز
ایک گٹھری میں باندھ کر
تمھاری چوکھٹ پر رکھ دوں۔۔۔''
(مجھے شاعری نہیں آتی)

''میں ترے کرتے کا دامن تھاموں
آؤ ہم ریل بنائیں۔۔۔
آؤ ہم ریل کو پیچھے لے جائیں۔۔۔''
(وقت کی ریل گاڑی)

''ہوش میں آؤ۔۔۔ہم کو
وقت کے دھارے پر بہنا ہے
ہم کو ان لوگوں میں
اس دنیا میں رہنا ہے''
(بند دروازے)

''پھر ایک نرم ہوا کا جھونکا
اور منظر نے کروٹ لی
میرے جسم کے گملے میں اظہار کا پردا
ایک ٹہنی پر نطق کا پھول اپنی پلکیں جھپکا تا
پنکھڑیوں کی اوٹ سے آنکھیں کھول رہا تھا!!
(تو خاموش تھی)

مصحف کی نظموں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ایک بے حد حساس،

دردمنداور بےلوث زندگی کا شاعر آپ سے ہم کلام ہے۔ وہ فرد کے قریب تر مسائل سے گہرے طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ اور معصوم زندگی کی رعنائیوں کے شائق ہیں۔ مصحف نے اصولوں، عقائداوراس قسم کے ناصحانہ موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ نہیں دی ہے لیکن ان کی تخلیقات کے پس منظر سے ایک ایسا فرد احساس پر ابھرتا ہے جو صالح سوچ، متوازن زندگی اور سادہ طرز حیات کی تجسیم ہے۔ آپ مصحف کے کلام کے مختلف ادوار سے گزریں گے تو یہ ضرور محسوس کریں گے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ان کی شاعری کے تار و پود کی زیریں رو میں آہستہ آہستہ ایک نمائندہ تبدیلی بہت حد تک زندگی کی بدلتی ہوئی روش اور شاعر کے خالص تجربات حیات کے اِکتساب سے منتج ہوتی ہے۔

وہی شاعر جو اِبتدائی دور میں چاہتوں، دوست داریوں اور کار جہاں کی جہد میں مصروف ملتا ہے، اب حقائق سے روشناس ہو کر غیر رومانی فلسفیانہ صداقتوں سے دو چار ہے اور بکھرتی ہوئی زندگی کو سمیٹنے کے لیے کوشاں ملتا ہے اور کمال یہ کہ دونوں ادوار میں اسلوب کی مخصوص انفرادیت قائم ہے۔

بلاشبہ مصحف اقبال توصیفی جدید شاعری کا ایک اہم نام ہے اور ان کی شاعری ایک منجمد لیکن پُرشور دریا کی طرح ہے کہ رواں ہو جائے تو سیل۔ در۔ سیل اپنے مخاطب کو بہالے جائے، اپنی جاری و ساری حسیت کی لہروں پر!

☆☆☆

Barq-e-Kaleesa-Akbar Allahabadi : Ek Tajziyati Mutala by Prof. Shahina Rizvi (Ex. HOD Urdu MGKVP, Varanasi) cell-9307380555

پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہء اردو، ایم۔جی۔کے۔وی۔پی، وارانسی)

برق کلیسا۔اکبر الہ آبادی: ایک تجزیاتی مطالعہ

دنیا میں اٹھارہویں صدی سے ہی بہت تیزی سے تبدیلیاں آنی شروع ہوگئی تھی۔انقلاب فرانس نے بادشاہت کی سیاست کی جڑیں ہلا دی تھیں۔اب دنیا میں ملکوں کی سرحدیں مقرر ہونے لگیں تو شخصی حکومت کی بنیاد ہی مٹنے لگی۔اب انسانی ذہن نئی قدروں اور نئی راہوں سے متعارف ہونے لگے۔یوروپ نے جہالت وتوہمات کا چولا پہلے ہی اتار پھینکا تھا، اب نئے علوم سے راہیں روشن ہونے لگی تھیں۔یہ تبدیلی اچانک تو نہیں ہوئی تھی اس سے پہلے گلیلو کو زمین کے گول ہوئے بیان پر موت کی سزا سنائی جا چکی تھی۔وہ مذہبی رہنما جو جنت کا پروانہ اس دنیا کو بانٹ رہے تھے، حقیقت کا سامنا نہ کر سکے۔مذہبی دیوانگی بھی عجیب چیز ہے جو حقیقت کو ماننے سے انکار کرتی ہے۔صدیوں بعد جب یوروپ میں علوم پھیلنے لگے تو نسلی برتری کا احساس قوی ہو گیا اور اس احساس نے کچھ ایسی اتھل پتھل مچائی کہ کئی ملکوں کو نہ صرف غلام بنایا بلکہ ان کی معیشت ہی تباہ کر ڈالی۔طاقت کی دیوانگی انسان کو اس راہ پر لے چلی ہے جو دوسروں کی تباہی پر منحصر ہوتی ہے۔ملکوں میں کالونیاں بنیں اور پرانا نظام درہم وبرہم ہوگیا۔بقول غالبؔ ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

اور ہر عروج زوالے دارد کے مصداق رسم ورواج، روایات اور تہذیبوں میں تبدیلیاں شروع ہوگئیں۔پہلے انسانوں پر حکومت ہوتی تھی اور غلام بنائے جاتے تھے

اب ملک غلام بننے لگے جس میں برطانیہ سب سے کامیاب رہا۔تبدیلیاں دنیا وسماج کا ایک فطری عمل ہے۔تبدیلیاں ترقی بھی لاتی ہیں لیکن ذہنی غلامی؟ یہ مسئلہ زیادہ تکلیف دہ تھا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ بادشاہت ہمیشہ قائم رہنی چاہیے تھی نہ میرا مقصد یہ ہے کہ نئے علوم آنے ہی نہ چاہیے تھے۔ترقی اور بہبودی جو انسانیت کو بہتری کی طرف لے جائے کسی قوم وملک سے حاصل ہو قابل تسلیم ہے لیکن ساتھ میں دو اور پہلو ہیں کہ دنیا کی ہر چیز اور ہر علم اور انسانی ذہن مکمل نہیں ہوتا۔ ہر جگہ اچھا اور برا دونوں پہلو ایک ہی شے میں چھپا ہوتا ہے۔اور دوسرا پہلو یہ کہ جب کوئی نئی شے یا خیال وجود میں آتا ہے تو پرانے نظام سے تصادم بھی ضرور ہوتا ہے۔اور اثر زیادہ تر نئی چیزیں خیال وفکر اپنی جگہ بناتی ہی ہیں اور ایسے وقت میں سماج بھی تذبذب کی حالت میں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں یہ تصادم انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی پہلی دہائیوں میں زیادہ شدت سے نظر آتا ہے۔ ہندوستانی عوام وخواص سبھی ایسی کشمکش کا شکار تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں برطانیہ سے شکست کھانے کے بعد تمام ہندوستانی اور مسلمان خاص طور ایسی منزل پر کھڑے تھے جہاں کئی نئی راہیں تھیں۔جن میں سے کوئی راہ چننا بہت دشوار تھا۔حکومت جا چکی تھی اور ملک کی باگ ڈور اس قوم کے ہاتھ میں تھی جو ہندوستانیوں کو غیر مہذب، جاہل سمجھتے تھے اور بڑی حد تک انسانوں میں شمار ہی نہ کرتے تھے۔ ان کے قوانین ہندوستانیوں کے لیے ہتک آخیز تھے۔اس تفریق نے مسلمانوں کو احساس کم تری کا شکار بنا دیا تھا۔اس لیے وہ اپنے رسم ورواج وفکر کو بہت شدت سے پکڑے ہوئے تھے۔

ایسے ہی دور میں اردو ادب کی دنیا میں دو ایسی شخصیتیں نظر آتی ہیں ایک سرسید احمد خاں کی اور دوسری اکبر الہ آبادی کی۔ جو کہیں نہ کہیں اپنے قوم کی زبوں حالی سے دل برداشتہ تھے۔لیکن دونوں کی فکروں میں تضاد تھا۔سیاسی طور پر دونوں کا ذہن وشعور جاگا ہوا تھا۔ دونوں ہی جانتے تھے کہ اب سیاسی اور سماجی طور پر ہندوستان کس حال میں ہے۔سرسید نے انگریزوں سے ہوئی مات پوری طرح قبول کر لی تھی اور ان علوم کے

ساتھ ان کے رسم و رواج کو بھی قبول کر لیا تھا اور اس کی تنبیہ ہندوستانی مسلمانوں کو بھی کرتے تھے۔ اکبرؔ نے بھی اس حقیقت کو مان لیا تھا کہ اب حکومت بدل گئی ہے۔ انگریزی تعلیم حالات ناساز ہوتے ہوئے بھی حاصل کی۔ اس کی اہمیت وقدر کا احساس بھی تھا لیکن اپنی تہذیب وقدریں بھی بہت عزیز تھیں۔ یوروپ کے علوم کے وہ دلدادہ تھے لیکن تہذیب کے مخالف۔ اس لیے ان کا ذہن اس تہذیب کو اپنا نہ سکا۔ انہوں اپنی تہذیب کی خوبیاں بھی بیان کیں اور دبی دبی زبان سے اس کا شکوہ بھی کیا۔ یوروپ کی تہذیب کے وہ خلاف کیوں ہیں اور جانتے ہوئے یہ زمانہ بدل جائے گا۔ ''مستقبل'' اس کی بہترین مثال ہے۔

اکبر نے انگریزوں کو نہ شعوری طور پر اور نہ ہی لاشعوری طور پر ہندوستانیوں سے برتر سمجھا، اس کا احساس ان کے ظریفانہ اور طنزیہ کلام میں جگہ جگہ موجود ہے جو اتنا لطیف اور شائستہ ہوتا ہے کہ ان کے خیالات کو واضح کر جاتا ہے اور اتنا گہرا ہوتا ہے، پڑھنے اور سننے والے ان کے خیال کے ہم نوا ہو جائیں۔ ان میں وطن پرستی کا شدید جذبہ تھا۔ اپنی ذات پر یقین تھا اسی لیے وہ لاشعوری طور پر بھی انگریزوں کی برتری تسلیم نہیں کرتے۔ وہ رسالہ ''اودھ پنچ'' سے وابستہ تھے جو سیاسی اور معاشرتی طور پر انگریزوں پر اکثر طنز وتعریض کے مضامین ونظمیں شائع کرتا تھا۔ مسلمانوں کی روش پر بھی اکبرؔ کے طنز بہت گہرے ہوتے ہیں۔ نظم ''برق کلیسا'' میں اکبرؔ ایسی تبدیلیوں، سیاسی وسماجی افراتفری کی نکتہ چینی انتہائی دبی دبی زبان میں ظریفانہ طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ ان کا طنز ظرافت سے خالی نہیں ہوتا۔ ''برق کلیسا'' کی ترکیب بھی برجستہ اور انتہائی مناسب ہے۔ یہ وہ برق نہیں جسے موسیٰ نے کوہ طور پر دیکھا (یا محسوس کیا کیونکہ موسیٰ تو چمک سے ہی بے ہوش ہو گئے تھے) جس نے کوہِ طور کو خاکستر کر دیا۔ بلکہ یہ کلیسا یعنی ''چرچ'' کی ہے جو دنیاوی ہے۔ یہ اس عیسائیت کی روشنی نہیں ہے جو عیسیٰ کی تبلیغ کے اصول میں تھی بلکہ یہ اس چرچ کی مظہر ہے جو عیسائیت کے ظاہر کی نمائندہ ہے جس میں چمک تو بہت ہے لیکن

انسانوں کی بنائی ہوئی ہے جو اس نور سے مختلف ہے جس میں اتنی طاقت تھی کہ ہر شے کو خاک کر دے۔ یہ برق انگریز حسینہ کے لیے استعمال ہوئی جو متاثر تو شدید طور پر کرتی ہے لیکن نور الٰہی کی سی طاقت نہیں بلکہ خود بھی اس سے متاثر ہو جاتی ہے جو اس کے اثر سے خود اس کی طرف کھنچ آتا ہے۔ اب چراغوں و سمتوں کا دور ختم ہو چکا تھا اور بجلی کا دور آ چکا تھا اس لیے اکبرؔ نے یوروپ کی اس نئی ایجاد کو حسن کا نمائندہ بنایا۔ یہ حسن اس خطے سے وابستہ ہے جہاں سے اس برق کی ایجاد ہوئی۔ کلیسا بھی اس لیے چنا ہے کہ اس کی ملاقات چرچ میں ہوئی ہے اور وہ مذہب کی پابند ہے۔ ذرا رک کر اس پر بھی غور کر لیتے ہیں کہ ہماری پوری قومی (ہندوستانی) تہذیب میں واضح طور پر عورتوں کو دو حصوں میں بانٹا گیا تھا۔ ہماری اردو شاعری میں غذلوں کا محبوب حسین، شوخ، چنچل، بے پرواہ و بے وفا مانا جاتا تھا (تھا اس لیے کہ اب غزلوں میں کافی فرق ہوا ہے) ایسا نسوانی کردار محبوب کی صورت میں بہت عزیز ہے اور دوسرا وہ حصہ ہے جو شرم و حیا کی پتلی ہے۔ جو صرف شوہر سے وابستہ ہے اس کی وفادار ہے۔ ناز و غمزہ سے دور ہے اور ایک بے ضرر اور محکوم انسان ہے۔ جو گھر کی زینت و رونق ہے۔ اس کی اپنی کوئی شناخت نہیں۔ اکبرؔ کے عہد تک یہ لکیر بہت واضح نظر آتی ہے لیکن اس دور کے بعد کچھ تبدیلیاں ہوئیں۔ گو شعوری طور پر اس حد کو ضرور توڑا گیا لیکن لاشعوری طور پر آج بھی بیشتر لوگوں (ان میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں) ایسی روایت کو پسند کرتے ہیں۔ خود اکبرؔ کا بھی یہی خیال رہا ہے ؎

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی شمع محفل ہے وہ اب پہلے چراغ خانہ تھی

اس بات سے تو سبھی واقف ہیں کہ شمع محفل اس عہد میں کن عورتوں کے لیے مخصوص تھا اور چراغ خانہ کون ہوتی تھیں۔ اکبرؔ نے برق کلیسا کا لفظ جس انگریز خاتون کے لیے استعمال کیا وہ بھی اسی خیال کے تحت کیا۔ وہ بھی طوائفوں کی طرح آزاد ہوتی ہیں گو کہ ان کی آزادی اور بے باکی اس مقصد کے لیے ہرگز نہیں ہوتی جو طوائفوں کا شیوہ ہے۔ اس کی اپنی شناخت ہے اور بے جا شرم و حیا سے دور ہے۔ برق اس لیے بھی کہ اس

کا حسن اتنا سحر کن ہے کہ دیکھنے والے کو مسحور اور آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔ وہ اس کی تعریف کرتے ہیں اور اسی طرح اس کے علم سے بے انتہا متاثر بھی ہیں۔ اس کی بے باکی میں عشوۂ ناز ادا بھی نظر آتا ہے۔

گرم تقریر جسے سننے کو شعلہ لپکے　　دلکش آواز کہ سن کر جسے بلبل جھپکے
پہلوئے حسن بیاں شوخیٔ تقریر میں غرق　　ترکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اکبرؔ کی نظم ''تعلیم نسواں'' انہیں پرانے نظریے کی گونج سنائی دیتی ہے جو اس مسلم معاشرے میں رائج تھیں۔ ان کو بھی خوف تھا کہ عورتیں نئے علوم کو حاصل کر کے بے راہ و رو ہو جائیں گی۔ علم صرف طوائفوں کے لیے مخصوص تھا۔ اکبرؔ نے اس کے حسن کا جو سراپا پیش کیا وہ وہی ہے جو ہماری غزلوں میں پیش کیا جاتا تھا۔ حالانکہ اکبرؔ اس کے علم کے معترف بھی ہیں لیکن لاشعوری طور پر اس کی اہمیت صرف اس کے حسن تک محدود ہے۔ اکبرؔ مانتے ہیں کہ وہ عمدہ سیاسی شعور کی مالک ہے۔ اس کی پرکھ ان کو تھی کیونکہ خود ان کا سیاسی شعور بہت پختہ تھا۔ اسی کے ساتھ وہ دنیا کے دوسرے ملکوں کی سیاست سے بھی واقفیت رکھتے تھے اور حکومت برطانیہ کس طرح سے سیاسی افراتفری میں کس قدر ملوث تھی۔ قیام فلسطین اور ترکی کے سیاسی حالات کا ذمہ دار کون ہے؟ اکبرؔ کی شاعری میں Imagiry سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ان کی نظمیں اور اشعار اس کے گواہ ہیں۔ بات خواہ احساسات کے بیان کی ہو یا کردار کی ہر شعر پیکر تراشی کی مثال ہے۔ چاہے وہ شیخ و بدھو ہو، مولوی مدن یا پھر کسی مس سیمیں بدن کا۔ اس قدر برجستہ اور واضح ہوتے ہیں کہ تصور میں نقش ہو جاتے ہیں۔ دیکھئے برق کلیسا کی تصویر کتنی واضح ہے۔

رات اس مس سے کلیسا میں جو ہوا دو چار　　ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ نکھار
زلف پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید　　قد رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہ گار کریں　　گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں

پڑھ کر ہی پوری تصویر اس خاتون کی نظر آنے لگتی ہے اور صرف ظاہری پیکر ہی نہیں اس کردار کی ہر خصوصیت سامنے آجاتی ہے جو شوخ و حسین ہونے کے ساتھ علم سے مزین ہے۔ جو بے باک ہے آزاد فطرت کی مالک۔ نہ صرف اکبرؔ نے اس خاتون کی پیکر تراشی کی بلکہ ایسے حسن پرست عاشق کی تصویر پیش کی ہے جو اس کو دیکھتے ہی فدا ہو جاتا ہے۔ ایسے مرد کا نقشہ بھی ایسا کھینچا ہے کہ عام زندگی میں ایسے کردار سماج میں نظر آتے رہتے ہیں۔

ضبط کے عزم کا اس پر بھی اثر کچھ نہ ہوا یا حفیظؔ کا کیا ور دمگر کچھ نہ ہوا

یہ کردار ایک ایسے نوجوان کا ہے جو حسن کا شیدائی ہے۔ وہ کسی مضبوط کردار کا مالک نہیں ہے اور اکبرؔ نے سوچ سمجھ کر ایسا کردار پیش کیا ہے کیونکہ ان کو اپنے سماج و حالات کا نقشہ پیش کرنا درکار ہے۔ جس کا احساس وہ آخر میں مسلمانوں کو دلانا چاہتے ہیں جن میں کردار کی وہ پختگی ختم ہو گئی ہے جو ماضی میں ان کی پہچان تھی اور دوسری طرف انگریز خاتون کے کردار کے ان پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتے ہیں جس میں وہ پرانی قدریں ختم ہو چکی ہیں اور دوسری قوموں (خاص طور پر مسلمانوں) کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ وہ ان کا وہ نظریہ واضح طور پر نظر آتا ہے جو لاشعوری طور پر سرسید کے اس نظریہ کے خلاف ہے جس میں وہ مسلمانوں میں تبدیلی چاہتے ہیں جو پورے معاشرے کو یوروپی تہذیب میں رنگا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور وہ بار بار اس کی تبلیغ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو انگریزوں کو اپنا حاکم ماننا چاہئے اور عملی طور پر اس کی کوشش بھی کی جس کی بہترین مثال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ علوم کی اہمیت اور حاصل کرنے کے حامی اکبرؔ بھی تھے لیکن اپنی تہذیب و معاشرے میں تبدیلیاں پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے وہ اس کے خلاف تھے۔ انہوں نے علی گڑھ کو امراض کا مجموعہ کہا ہے ''خدا علی گڑھ کے مدرسے کو تمام امراض سے شفا دے۔'' اور سرسید کے بارے میں ان کا خیال ہے:

سید کا جو عہد مشن تھا اس سکے کا ٹھیک چلن تھا

حسب ضرورت طرز سخن تھا وقت تھا اور ہی اور ہی سن تھا

ان کی شاعری میں بیک وقت مزاح اور میٹھا طنز ہر شعر میں جھلکتا ہے:

پہن لے ''سایہ'' مری جان اتار کر پشواز زمانہ باتو نہ سازد تو بہ زمانہ بہساز

''برق کلیسا'' میں ان کا انداز ایسا ہی پرسکون اور پرمزاح ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ایک نوجوان ایک انگریز حسینہ پر عاشق ہو گیا لیکن اس کی نظر میں اس حسین خاتون کی وقعت اتنی ہی ہے کہ وہ اس پر قابض ہو جائے اس کے علم اور حسن قدر اس کی نظر میں کچھ بھی نہیں۔ یہ بھی ہمارے سماج کی خصوصیات میں شامل تھا۔ یا پھر غور کریں تو ایسا محسوس ہوتا ہے اکبرؔ کو لاشعوری طور پر یہ احساس تھا۔ انگریز وہ قوم ہے جس نے ہندوستانی عورتوں تو دور مردوں کو عزت کے قابل نہیں سمجھا۔ یہ اس کا دبا دبا اظہار تھا یا پھر ہندوستانی تہذیب کی ان قدروں کا اثر جس میں اس وقت عورتوں کو علم حاصل کرنے اور برابری کا درجہ دینے کی اجازت نہ تھی، وہ اس خاتون سے بھی صرف یہ چاہتا ہے ؎

تو اگر عہد وفا باندھ کے میری ہو جائے ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے

اس کا جواب بھی جو ملتا ہے وہ اکبرؔ کے ذہن کی بیداری اور حقیقت پسندی کی مثال ہے۔ وہ مسلمانوں کے ماضی سے بھی واقف ہیں اور اس بات سے بھی جو اہل نصاریٰ کی عام طور پر اور وہاں کے تاریخ دانوں کی خاص طور پر کیا سمجھ ہے۔ یہ بھی انسان کی فطرت ہے کہ جس بات کو چاہے جس طرح کا رنگ دے دے اور حقیقت کبھی یک رخی نہیں ہوتی اور انسانی نفسیات بھی عجیب ہے کہ وہ حقیقت کے ہر رخ کو دیکھنا نہیں چاہتی اور جو بات جس طرح بیان کی جائے بغیر ثبوت کے اس پر یقین کر لیتی ہے۔ اس لیے اکبرؔ بھی اس انگریز خاتون کا جواب بھی اہل نصاریٰ کے خیال کے مطابق ہی دلواتے ہیں:

غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

اس ایک شعر نے مسلمانوں کی فتوحات اور جوش و جذبے کے ساتھ تاریخ ماضی کے صفحات کھول کر رکھ دیے ہیں۔ اور صلیبی جنگوں کا پورا خلاصہ اور عیسائیوں کی نفرت جو

سالہا سال تک ہونے والی مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جنگوں سے اور مسلمانوں کی فتوحال کے نتیجے میں ہوئی وہ نظر آتی ہے۔ اور اکبرؔ کا کمال یہ دیکھئے کہ انہیں شعر کہنے میں کتنا ملکہ ہے کہ اس شعر سے قصیدے کے اہم جز گریز کی طرح اپنے اصل مقصد کی طرف پلٹتے ہیں۔ اکبرؔ نے اس نظم کو اس قصیدے میں لکھا ہے کہ انہیں انگریزی خاتون کے حسن کی تعریف کرنا مقصود تھی۔ نہ اس مقصد سے کہ کسی عاشق کے جذبات کا ذکر کرنا ہے۔ یہ ساری ضمنی باتیں ہیں اور ایک تمہید ہے اس بیان اور افسوس کے لیے جو مسلمانوں کی معاشرت میں گھر کر گئے تھے۔ جہاں ایک عرصے سے جمود طاری تھا۔ عمل سے مسلمان دور ہو چکا تھا۔ جس کا وہ اس خاتون کی زبان سے اس کے ماضی کا بھی ذکر کرتے ہوئے اور پھر اپنے وقت کے جمود کا اور قوم کی احساس کمتری پر طنز کرنا مقصود ہے۔ یوں بھی ان کی شاعری میں مسلمانوں کے طریقوں اور جینے کے انداز سے مایوسی ہی ملتی ہے۔

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبرؔ مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہد مقصود کے ہیں نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس

انگریز خاتون ایک طرف لاشعوری طور پر یہ ذکر کر جاتی ہے کہ وہ اتنے بہادر ہیں کہ اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کرتے۔ نہ انہیں آگ کا ڈر ہے اور نہ توپوں کا۔ لیکن یہاں اکبرؔ کی شاعرانہ پختگی اور چابک دستی کا کمال ہے۔ مسلمانوں کے ماضی کی خوبیاں تو بیان ہوگئیں اور ایک دشمن کے زبان سے لیکن دشمن کی نفرت کے ساتھ۔ جو اس کی خوبیوں کو برائی کی نظر سے دیکھتی ہے لیکن انجانے میں حقیقت بیان کر جاتی ہے۔

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر
کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں
گل کھلائے کوئی میداں میں تو اتر اجائیں پائیں سامانِ اقامت کو قیامت ڈھائیں

اور اکبرؔ نے جو جواب میں یہ اشعار قلم بند کیے ہیں وہ گویا ان کی قوم کا مرثیہ ہے، جسے بیان کرنا ان کا اصل مقصد ہے کہ مسلمانوں کو ماضی اور سارے اصولوں اور ان

قدروں کو بھلا دیا ہے۔ اب نہ ان کو دین سے مطلب ہے اور نہ اپنے ماضی کی بہادری سے۔ وہ تو اب یوروپی کلچر اور عیاشی کا پیروکار ہے وہ نہ غازی ہے نہ جاں باز۔

ہم میں باقی نہیں اب خالد جانباز کا رنگ دل پہ باقی ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

حافظ شیراز گویا علامت بن گیا عشق و محبت اور آرام کوشی کے۔ حافظ نے ہمیشہ نرم و نازک لہجہ میں فارسی محبت کی نمائندگی کرنے والی غزلیں ہی لکھیں ہیں۔ یہاں مجھے حافظ کی شاعری کا مواخذہ و جائزہ نہیں پیش کرنا بلکہ بیاں کرنا یہ مقصود ہے کہ اکبر کی شاعری میں کتنے چست اور برجستہ شعر ہوتے ہیں۔ اور بات کو چند لفظوں میں صرف ایک علامت کا استعمال کر کے اتنی خوبصورتی سے بیان کر جاتے ہیں کہ ذہن میں پورا خاکہ بن جاتا ہے۔ ایک سماج کا ایک پورے معاشرے اور معاشرے سے وابستہ انسانوں کا۔ اور ان لوگوں کو اس کا احساس بھی نہیں کہ وہ تیزی سے تنزلی کی طرف گامزن ہیں۔

مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپ کو اے جان نہیں نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

اکبر نے بغیر کسی تلخی کے اتنی گہری باتیں اس نظم میں کہہ ڈالی ہیں کہ اس کا جواب ہو بھی نہیں سکتا۔ ایسی باتیں صرف ہندوستانی مسلمانوں ہی میں نہیں پوری دنیا کے مسلمانوں میں جاری و ساری تھیں۔ وہ اس طرف انتہائی ظریفانہ اور شائستہ لہجے میں اشارہ کرتے ہیں۔ اس نظم میں جس طرح اکبر مسلمانوں کی زبوں حالی کا بیان کرتے ہیں وہ ان کی شاعرانہ قابلیت کا مظہر ہے۔ طنز و مزاح کی راہ بہت پرخطر ہوتی ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے سارا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور یہ اکبر کی شاعرانہ پختگی کا کمال ہے اور لفظوں پر عبور تو ان کا اتنا مضبوط ہے کہ ہر شعر میں برجستگی آ گئی ہے۔ حالانکہ یہ اپنی معاشرت و تہذیب کی تنزلی کا بیان ہے لیکن اس میں تلخی نظر نہیں آتی۔ یہ قدرت صرف اکبر کو حاصل ہے ان کا اس روش پر کوئی ثانی نہیں۔

☆☆☆

The Journey of Eduvcation for the People with Special Needs : Laws and Policies from Independence to NEP 2020 by Dr. Neda Shahab and Dr.Imran Ansari (cell-8882424421) Assit. Professors,MANUU College of Teacher education, Asansol)

ڈاکٹر ندا شہاب، ڈاکٹر عمران انصاری (اسسٹنٹ پروفیسرس، مانو، سی۔ٹی۔ای۔آسنسول)

مخصوص ضروریات کے حامل افراد کی تعلیم کا سفر

(آزادی سے نئی قومی پالیسی 2020 تک بنیادی قوانین اور پالسیاں)

تعرف: تاریخ میں مخصوص ضرورتوں کے حامل افراد کے لئے ہوسکتا ہے کہ کام کیا گیا ہو لیکن عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ مخصوص ضرورتوں کے حامل افراد کو سماج میں ہمیشہ نا قابل قبول نظریہ سے ہی دیکھا گیا، انھیں سماج کا حصہ نہیں سمجھا گیا اور یہی سوچ اج بھی مختلف اطوار میں محسوس کی جاسکتی ہے جیسا کہ اگر آج بھی کوئی بچہ مخصوص ضرورتوں کا حامل ہے تو کئی بار اس بچہ کے والدین اور اہل خانہ اس بچہ کو قبول نہیں کرتے ہیں اور ان کو لمبا عرصہ لگتا ہے کسی مخصوص ضرورتوں کے حامل بچہ کو قبول کرنے میں۔ ابھی بھی مختلف جگہوں پر مخصوص ضرورتوں کے حامل افراد کے ساتھ برابری کا برتاو نہیں کیا جاتا جیسے کئی جگہ پر مخصوص بچہ کو بند کر کے رکھا جاتا ہے کہیں پر مخصوص ضرورتوں کی حامل لڑکی کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ خاندان کی تقریبات میں حصہ نا لے اور یہ کہ وہ خود کو کمرے میں بند رکھے جب بھی گھر میں مہمان ائیں۔ لیکن اس سکہ کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ عام انسان سے لے کر حکام تک تمام افراد میں مخصوص ضرورتوں کے حامل افراد کے لئے انسانی سوچ اور برتاؤ میں کچھ بہتری دیکھی جاسکتی ہے، اب یہ بدلاؤ حقیقت میں مثبت ہے یا قوانین اور

میڈیا کا اثر ،لیکن پھر بھی مخصوص ضرورتوں کے حامل افراد کے لیے بہتر ہے۔ اگے ان تبدیلیوں اور کاوشوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں جو منظر عام پر آئیں۔

انیسوی صدی میں تعلیم کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو دیکھا جا سکتا ہے کہ خصوصی تعلیم کا سفر بامعنی طور دوسری جنگ عظیم کے بعد شروع ہوا تھا اس کی ایک وجہ بہت سے جنگجوؤں کا دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنے اعضاء سے معذور ہو جانا تھا مثلاً بہت سے جنگجو جسمانی طور پر معذور ہو گئے تھے۔ منتظمین نے ان فوجیوں کی بہتری کے لیے کام شروع کرنا شروع کیا، اس سے معاشرے میں تبدیلی آئی اور مخصوص ضرورتوں کے حامل افراد کو بالکل الگ تھلگ سمجھنے کے بجائے اب تھوڑا اپنائیت کا انثر نظر انے لگا اور ان سے متعلق کیے جانے والے کام میں بہتری آئی۔ اس شعبہ کے علمبرداروں نے جیسے پیڈرو پونس، مشیل ڈی اپے، اٹارڈ، لوئس بریل، سیگوئن، مونٹیسوری اور ڈیکرولی نے مخصوص ضروریات والے افراد کی زندگی میں خوبصورت رنگ بھرنے کے لیے انتھک محنت کی جیسے جین-مارے-گاسپارڈ-اٹارڈ (1775-1838)، وہ معلج جس نے "ایوریون کے ایک لڑکے" کو" قابو" کیا۔ اگرچہ اٹارڈ کامیاب نا ہو سکے وکٹر کو نارملائز کرنے میں، لیکن انھوں نے تعلیم کے ذریعے وکٹر کے رویے میں موثر تبدیلیاں لائیں۔ جدید خصوصی تعلیم کے طریقوں کی جانکاری ہمیں اٹارڈ تک لے جاتی ہے اور ان کا کام خصوصی ضروریات کے حامل طالب علم کو تعلیم دینے کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔

انیسویں صدی میں، تمام قابل اور خصوصی ضروریات کے حامل افراد کے لیے لازمی تعلیم کو یقینی بنانے کی تصدیق کی گئی۔ لیکن میڈیکل ماڈل' کی طرح ابھی بھی یہی سوچ تھی کہ معذوری، فرد کی جسمانی یا ذہنی حدود کا نتیجہ ہے اور اس کو درست ہونے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے خصوصی ضروریات کے حامل افراد کو علاج اور بحالی کی خدمات مہیا کی جانی چاہئے۔

'اب عوام کی سوچ میں مذیدانی شروع ہوئی جیسے سوشل ماڈل' کے ظہور کے ساتھ ان

خیالات کی اصلاح کی گئی ہے کہ جس میں یہ مانا جاتا تھا کہ معذوری، ماحول، معاشرے اور لوگوں کے رویوں یا ایٹیٹیوڈ کا نتیجہ ہے۔لیکن اج بھی تمام سماجی پہلوؤں میں مزید کوششوں، اصلاح اور ترقی کی ضرورت ہے تا کہ اپنی زمین کو معذوروں اور غیر معزوروں کے لیے قابل عمل بنایا جا سکے اور عام و معذور افراد آسانی سے ایڈجسٹ ہو سکیں، انہیں معاشرے میں اس فرد کے طور پر قبول کیا جائے جو دنیا میں آیا ہو۔

آئی سی ایف نے عالمی رپورٹ کے لیے ایک تصوراتی فریم ورک کو اپنایا اور معذوری کو صحت، حالات یا سماجی عوامل جیسے ذاتی اور ماحولیاتی سنگم کے طور پر سمجھنے کی کوشش کی۔ جس کو" بائیوسائیکو۔سوشل ماڈل کا نام دیا گیا ہے (معذوری کی تعریف، 2009)۔

پھر اگلا ماڈل، ہیومنسٹ ماڈل ہے جو قابل قدر انسانی حقوق کی پاسداری کرتا ہے۔سب سے پہلے تو معذور افراد کو انسان سمجھتا ہے اور اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ ان کا بطور انسان احترام کیا جانا چاہیے۔ یہ حق پر مبنی ماڈل، معذوری کے بجائے انسانی وقار کے حصول پر زیادہ زور دیتا ہے۔خصوصی تعلیم میں بہت سے تصورات استعمال کیے گئے ہیں (جیسے خصوصی بچوں کی منفرد ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خصوصی طور پر ڈیزائن کردہ ہدایات) جیسے اخراجی یا ایکسکلوجن تعلیم میں خصوصی بچوں کو معاشرے اور تعلیم سے الگ تھلگ رکھا گیا۔علیحدہ یا سیگریگیٹڈ تعلیم میں، ایک خاص ضرورت والے بچے کی تعلیم صرف دوسرے خصوصی طلباء کے ساتھ ممکن ہو پائی۔

مربوط یا انٹیگریٹڈ تعلیم میں، مرکزی دھارے کے اسکولوں میں غیر معذوروں کے ساتھ خصوصی ضروریات کے حامل طلباء کو جگہ دینے پر زور دیا گیا۔اسکول کا نظام غیر لچکدار اور ناقابل تبدیل ہی رہا جس کے نتیجے میں خصوصی ضروریات کے بچوں نے اسکول چھوڑ دیا۔اس نظام کے لیے، ایک بچہ ایک مسئلہ تھا اور اسے مروجہ نظام میں فٹ ہونے کے لیے بچہ کو خود میں تبدیلی لانے کی توقع تھی۔(این سی ای آر ٹی)۔

سو یا شمولیاتی یا انکلوجن تعلیم میں، خاص ضروریات والے طلباء کو عمر کے حساب سے

موزوں کلاس روم میں دوسرے ہم عمر طلباء یا مختلف صلاحیتوں، ذات، طبقے، جنس، زبان اور ثقافت وغیرہ طلباء کے ساتھ رکھا گیا۔ اب بچہ کے بجائے نظام کو ایک مسئلہ کے طور پر دیکھا جانے لگا اور اسے تمام بچوں کی ضروریات یا خصوصی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تبدیل کیا جانا کی طرف سوچ مرکوز ہوئی۔ بچوں پر مرکوز تعلیم پر زور دیا گیا نا کہ استاذ مرکوز۔

شمولیاتی تعلیم کے حصول کے لیے اہم بین الاقوامی اعلامیہ: جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ سماجی تبدیلی کا سب سے طاقتور ذریعہ تعلیم ہے۔ جس کے ذریعہ، معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان خلیج کو درگزر کرنے میں مدد ملتی ہے۔ تعلیمی نظام میں مختلف تبدیلیاں آتی رہی ہیں جیسا کہ درج ذیل ہیں:

انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ (1948)–اس اعلان میں وہ تمام حقوق دینے کی کوشش تھی جو ایک انسان کو پرامن زندگی گزارنے کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ ہندوستانی آئین ، بنیادی حقوق کے طور پر تمام حقوق کو ہر انسان کا حق قرار دیتا ہے۔

بچوں کے حقوق پر اقوام متحدہ کا کنونشن (1989)۔ یہ کنونشن بنیادی طور پر بچوں پر مرکوز تھا۔ بچوں کو حقوق عطا کیے گئے ہیں: زندہ رہنا، تحفظ حاصل کرنے اور تعلیم حاصل کرنے کے۔

سب کے لیے تعلیم پر عالمی اعلامیہ (1990)۔ جومٹین، تھائی لینڈ میں ۵ سے ۹ مارچ 1990 کو تعلیم کے موضوع پر عالمی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں تمام بچوں کے لیے پرائمری تعلیم کو قابل رسائی بنانے اور ناخواندگی کو کم کرنے کے لیے بات کی گئیں۔ سب کے لیے تعلیم کا عالمی اعلامیہ اپنایا گیا، جس نے تعلیم کو بنیادی انسانی حق کے طور پر ماننے کی حمایت کی اور سال 2000 تک سب کی بنیادی سیکھنے کی ضروریات کو پورا کرنے کا مشورہ دیا۔ اہداف میں شامل کیے گئے نقائط: سیکھنے میں عالمگیر رسائی، مساوات، سیکھنے کے نتائج، سیکھنے کا ماحول، اور شراکت کو مضبوط کرنا۔

معذور افراد کے لیے مواقع کی مساوات سے متعلق معیاری قواعد (1993) ۔ جنرل اسمبلی نے معذور افراد کے لیے مساوی مواقعات فراہم کرنے کے لیے اخلاقی اور سیاسی عزم کی بنیاد پر معذور افراد کے لیے مساوی مواقعات فراہم کرنے کے لیے معیاری قواعد بنائے، جو معذور افراد کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر سکیں۔ لیکن یہ قانونی طور پر نافذ نہیں ہو سکا۔

UNESCO Salamanca Statement and Framework(for Action1994)) ۔ جون میں مخصوص ضروریات کے حامل افراد کی تعلیم پر عالمی کانفرنس سلامانکا، اسپین میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے ذریعہ تعلیم کو سب کے لیے ایک حق کے طور پر قائم کیا۔ اس کے بعد، دنیا بھر میں، مختلف ممالک چاہے وہ ترقی یافتہ ہوں یا ترقی پذیر، سب نے شمولیت کی حمایت کے لیے پالیسیوں کو بنانے اور اپنانے کی شروعات ہوئی۔ مندرجہ ذیل نقائط پر انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے میں توجہ مرکوز کی گئی:۔

تعلیم حاصل کرنا، ہر بچے کو کا بنیادی حق ہے، ہر بچے کی مخصوص خصوصیات ہوتی ہیں اور تعلیمی نظام کو ان تنوع کو پورا کرنے کے لیے ڈیزائن کیا جانا چاہیے، خصوصی طلباء کو موافقت پذیر تعلیم کے ساتھ عام اسکولوں میں رسائی فراہم کی جانی چاہیے، سماج میں شمولیت کے حصول کے لیے شمولیاتی تعلیم سب سے مؤثر طریقہ ہے۔

ڈاکار فریم ورک فار ایکشن (2000)۔

سال 2015 تک سب کے لیے تعلیم کے حصول کے لیے، اور تعلیم کے چھ اہم قابل پیمائش اہداف کو تسلیم کرنے کے لیے، جس کا مقصد تمام بچوں کی سیکھنے کی ضروریات کو پورا کرنا رہا۔ ڈاکار فریم ورک فار ایکشن میں چھ اہداف مرتب کیے گئے ہیں:

۔ابتدائی بچپن میں دیکھ بھال اور تعلیم کو بڑھانا،

۔مفت اور لازمی پرائمری تعلیم،

۔معیاری تعلیم (کوالیٹی ایجوکیشن) ،

۔نوجوانوں اور بالغوں کے لیے زندگی کی مہارت۔

معذور افراد کی تعلیم کے قانون (انڈیوجول ودھ ایجوکیشن ایکٹ) کے ذریعہ سیکھنے کی معذوری کے حامل طلباء کو امریکہ میں خصوصی طور پر خدمات فراہم کی گئیں۔ یہ امریکہ کا وفاقی قانون ہے اس کو چار حصوں میں بانٹا گیا: پہلا حصہ مخصوص سیکھنے کی معذوری' کی اصطلاح کو واضح کرتا ہے، دوسرا حصہ رقم سے متعلق ہے، تیسرا حصہ زور دیتا ہے ان خدمات پر جیسے کہ مشاورت، خاندانی تربیت، گھریلو دورے، پیشہ ورانہ تھراپی، اسپیچ لینگوئج سہولیات اور فزیکل تھراپی ہیں اور اخری حصہ محکموں اور ایجنسیوں کی بہتری پر توجہ دیتا ہے۔

۔تمام معذور بچوں کے لیے ایجوکیشن ۔ میں، شیر خوار اور چھوٹا بچہ کا جزو شامل کیا گیا اور 1990 میں، منتقلی کی منصوبہ بندی ایک ضرورت بن گئی۔

1975 میں خصوصی ضروریات کے حامل طلبہ کو تعلیم فراہم کرنے کے لیے ایک قانون بنایا گیا جس کا نام ایجوکیشن فارال ہینڈیکیپ چلڈرن ایکٹ تھا۔ 1990 میں ایجوکیشن فارال ہینڈیکیپ چلڈرن ایکٹ کے نام کو تبدیل کر کے انڈیوجول ودھ ایجوکیشن ایکٹ رکھا گیا اور ایک معمولی بدلاؤ یہ ایا کہ ٹرانسیشن پلاننگ اب ایک ضرورت بنا دی گئی ۔ 1986 میں شیر خوار اور چھوٹے بچوں سے متعلق جزو کو اس میں شامل کیا گیا۔ 1997 میں قانون (انڈیوجول ودھ ایجوکیشن ایکٹ) میں ترمیم کی گئیں جیسے معذوری کی تعریف میں مذید معذوریتوں کو جوڑا گیا مثلاً ڈویلپ مینٹلی ڈیلے ۳ تا ۹ سال کے بچے۔اس ترمیم کے بعد ٹیکنالوجی، معذور بچوں اور نوزائیدہ بچوں، والدین کی تربیت، اور پیشہ ورانہ ترقی کے لیے اضافی گرانٹس کی اجازت مل گئی۔اس ایکٹ میں 2004 میں پھر تبدیلی کی گئی اور اس کو نو چائلڈ لیفٹ بیہائینڈ ایکٹ کے ساتھ جوڑ دیا گیا، قانون میں معاون ٹیکنالوجی پر توجہ مرکوز کی گئی، حکومتی اداروں اور عوامی رہائش گاہوں کو، تاہم، کچھ آلات و

سہولیات فراہم کرنا ضروری قرار پایا ۔(Stat. 1142104476,-Pub. L. No. 101)
اسکول کے اضلاع کو خصوصی تعلیم حاصل کرنے سے پہلے کسی بچے کے گریڈ لیول میں پیچھے رہ جانے کا انتظار نہیں کرنے اور یہ تعین کرنے کی بات کی گئی کہ دوسرے طریقے تلاش کریں کہ بچے کو کب اضافی مدد کی ضرورت ہے۔ اس کو پورے ملک میں ایک عمل کے ذریعے لاگو کیا جارہا ہے جسے رسپانس ٹو انٹرو ینشن کہا جاتا ہے۔

ہندوستان میں قانون سازی اور پالیسیاں:

ہندوستان میں، آزادی سے پہلے، خصوصی ضروریات کے حامل افراد کے لیے خدمات بہت محدود تھیں۔ خصوصی ضروریات کے حامل افراد کے لیے پہلا اسکول مخصوصنابینا افراد کے لیے بنایا گیا، جسے جین لیپوٹ نے 1869 میں کھولا تھا۔ چودہ سال بعد 1883 میں بمبئی میں سماعتی معزور افراد کے لیے ایک اسکول کھولا گیا۔ 1887 میں، عیسائی مشنریوں کی مدد سے امرتسر میں نابینا افراد کے لیے اسکول کھولا گیا۔ 18 ویں صدی کے دوران، خصوصی ضروریات کے حامل افراد کے لیے تمام اسکولوں میں جسمانی اہل بچوں کو تو جگہ دی گئی لیکن ذہنی معذوری کے حامل طلباء کے لیے پہلا اسکول 1918 میں قائم کیا گیا۔

20 ویں صدی کے پہلے نصف میں، سیاسی شخصیت اور ستیہ گرہ تحریک کے رہنما، گاندھی جی نے بنیادی تعلیم' کی اصطلاح کو متعارف کر کے ہندوستانی تعلیم پر برطانوی اثر کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ ان کا خیال پسماندہ آبادی کو پورا کرتا تھا کیونکہ انھوں نے دستکاری پر توجہ مرکوز کی تھی، جو دلتوں اور خصوصی ضروریات کے حامل افراد کے لیے بہتر تھا۔

1909 میں پرائمری تعلیم کو لازمی بنانے کے لیے بل پیش کرنے کی کوشش کی۔ خصوصی تعلیم سے متعلق، حکومت ہند کی پالیسی اور اقدامات ایک دوسرے سے پوری طرح متصادم دیکھائی دیے۔ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کی سارجنٹ رپورٹ (1944) نے تجویز کیا کہ خصوصی ضروریات کے حامل بچوں کو مرکزی دھارے میں

شامل کیا جائے۔لیکن حکومت کی طرف سے کارروائی اور غیر عملی اس تجویز کے برعکس ہے۔

مرکزی دھارے کے اسکولوں سے علیحدہ ورکشاپس اور پیشہ ورانہ اسکولوں کے قیام کی حکومت کی کارروائی نے اس کو مرکزی دھارے سے الگ کر دیا۔مذید دیکھا جائے تو ان میں سے زیادہ تر علیحدہ اسکول مہنگے اور شہروں میں واقع تھے جس کے نتیجے میں مخصوص ضروریات کے حامل افراد کو مزید پسماندگی یا مارجینلائزیشن کا سامنا کرنا پڑا۔

تعلیمی نظام کی بہتری کے لیے کوٹھاری کمیشن کو بنایا گیا۔اس کے ایکشن پلان میں معذور افراد شامل تھے لیکن بدقسمتی سے حکومت نے اس پر کبھی عمل درآمد نہیں کیا۔اس میں لکھا ہے" اب ہم معذور بچوں کی تعلیم کی طرف رخ کرتے ہیں۔ان کی تعلیم منظم ہونی چاہیے نا کہ صرف انسانی بنیادوں پر منحصر۔ان کی تعلیم منظم ہوگی تب ہی ین کی اموزش کا عمل اگے بڑھ سکتا ہے اور مناسب تعلیم عام طور پر ایک معذور بچے کو اس قابل بنا سکتی ہے کہ وہ اپنی معذوری پر قابو پا سکے اور ایک کارآمد شہری بن سکے۔سماجی انصاف بھی اس کا خواہش مند ہے.....مسئلے کے مجموعی نقطہ نظر پر، تاہم، ہم محسوس کرتے ہیں کہ مربوط پروگراموں کے ساتھ تجربات کی فوری ضرورت ہے اور ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ بچوں کو مربوط پروگراموں میں شامل کیا جائے"۔

1974 میں،منسٹری اف ویلفیئر نے معذور بچوں کے لیے مربوط تعلیم کی اسکیم بنائی۔اس پروگرام نے مخصوصی ضروریات کے حامل بچوں کو" کتابیں، اسکول یونیفارم، نقل وحمل، خصوصی آلات اور امداد کے لیے مالی مدد فراہم کی۔لیکن اساتذہ کی تربیت اور تجربے کی کمی کے ساتھ ساتھ آلات اور تعلیمی مواد کی عدم دستیابی جیسے بڑے مسائل کی وجہ سے 29 ریاستوں میں سے صرف ۱۰ میں اس کو لاگو کر پائے۔

نیشنل پالیسی 1986 نے آرٹیکل 45 کے تضاد میں کہا ہے کہ صرف کم معذوری والے بچوں کو ہی مرکزی دھارے کے کلاس روم میں شامل کیا جانا چاہیئے، جب کہ" اعتدال

سے شدید "معذوری والے بچوں کو علیحدہ خصوصی اسکولوں میں جگہ دی جانی چاہیے۔
نیشنل پالیسی 1986 کو نافذ کرنے کے لیے 1992 میں پروگرام آف ایکشن بنایا گیا جو اس کی تعریف کو وسیع کرتا ہے کہ ایک مخصوص ضروریات کا حامل بچہ جس کو عام تعلیم دی جا سکتی ہے اس کو کسی علیحدہ اسکول میں نہیں بھیجا جائے۔

سال 1992 میں ہندوستان کی رہیبلیٹیشن (Rehabilitation council) کونسل (آر سی آئی) ایکٹ کا سال بھی تھا۔ یہ پیشہ ور افراد کے لیے معیارات بنائے مخصوصا ساتذہ کو بھی اس میں شامل کیا۔

1995 میں، پرسن وود ڈس ایبلٹی ایکٹ کو قانون سازی میں منظور کیا گیا اور اس میں معذوری سے متعلقہ شعبوں کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا جن میں عمارت، تعلیم کے ساتھ ساتھ ملازمتیں شامل ہیں لیکن اس میں معذوری کی وضاحت کو کافی حد تک محدود رکھا گیا اور اس میں صرف ۷ معذوری کی قسموں کو ہی درج کیا گیا تھا۔ اس ایکٹ نے خصوصی اساتذہ کی تربیت پر توجہ دی اور یہ بھی مطالبہ کیا کہ تمام اسکولوں میں ایسی سہولیات ہونی چاہیں جو مختلف ضروریات کے حامل افراد کو اس کے ماحول کے ساتھ مطابقت کرنے میں مدد کرتی ہوں۔ لیکن فنڈز کی کمی کی وجہ سے پی ڈبلیو ڈی ایکٹ کا نفاذ عملاً ناممکن رہا۔

مفت اور لازمی تعلیم کا حق (RTE) ایکٹ، 2009 مخصوص طلبہ سمیت تمام بچوں کے لیے مفت اور لازمی ابتدائی تعلیم کو لازمی قرار دیتا ہے۔ وہ 6 سے 14 سال کی عمر کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی داخلہ، حاضری اور ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے لیے تعلیم فراہم کرتے ہیں۔ 2012 کی ترمیم کے مطابق، یہ یہ بھی لازمی قرار دیتا ہے کہ، ایک سے زیادہ اور/ یا شدید معذوری والے بچے کو گھر پر مبنی تعلیم کا انتخاب کرنے کا حق حاصل ہے (سماگرا شکشا، ڈی ایس ای ایل، جی او آئی)۔

ایس ایس اے 2001، اس بات کو یقینی بنائے گا کہ خصوصی ضروریات کے حامل ہر بچے کو، بنا کسی تفریق کے (چاہے وہ معزوری کے اقسام کی بنیاد پر ہو یا معذوری کی ڈگری کی

بنیاد پر) مناسب ماحول میں تعلیم فراہم کی جائے۔ایس ایس اے 'زیرو ریجیکشن' پالیسی پر چلتے ہوئے ہر بچہ کو تعلیمی نظام سے جوڑے گا اور کسی کو بنا تعلیم کے نہیں رہنے دے گا۔ اس میں شامل سہولیات ہیں: شناخت، فنکشنل اور فارمل اسیسمنٹ، ایجوکیشن پلیسمنٹ، امدادی اشیاء اپلائنسز، سپورٹ سروسز، ٹیچر ٹریننگ، ریسورس سپورٹ، IEP والدین کی تربیت اور کمیونٹی موبلائزیشن، پلاننگ اور مینجمنٹ جیسے اجزاء کا احاطہ کرتا ہے۔خصوصی اسکولوں کی مضبوطی، تعمیراتی رکاوٹوں کو ہٹانا، تحقیق، اور معذور لڑکیوں کی نگرانی اور تشخیص وغیرہ (مونڈل اجیت اور میٹے، جینتا، 2012)۔

فروری 2006 میں معذور افراد کے لیے قومی پالیسی جو معذوری کی روک تھام، سرٹیفکیشن، بحالی کے اقدامات جیسے معذور افراد کی جسمانی، تعلیمی اور اقتصادی بحالی سے متعلق ہے۔اس کے علاوہ یہ پالیسی معذور خواتین اور بچوں کی بحالی، رکاوٹ سے پاک ماحول، سماجی تحفظ، تحقیق وغیرہ پر بھی توجہ مرکوز کرتی ہے (ویکاس پیڈیا)۔

معذور افراد کا حق کا ایکٹ 2016: 1995 کے ایکٹ خصوصی ضروریات والے بچوں کے سات معذوریاں اور ریزرویشن تھا لیکن 2016 کے ایکٹ میں مساوی حقوق دیے گئے، معذوری کے 21 اقسام کو جگہ دی گئی، ۴ فیصد ریزرویشن اور معیاری معذوری کی بات کی گئی جس کا مطلب ہے وہ شخص جس کی معذوریت چالیس فیصد سے کم نہ ہو۔رائٹ ٹو پرسن ودھ ڈس ابیلیٹی ایکٹ (Right to Disability Act-2026) یا یہ ایکٹ خصوصی ضروریات والے لیکن عوامی نظریہ کے اندر کسی شخص کی تذلیل کے لیے قید کے طور پر تحفظ فراہم کرتا ہے۔

اس ایکٹ کے نفاذ سے پہلے خصوصی قابلیت کے سرٹیفکیشن سے متعلق مسائل، تشخیص کے لیے وسائل کے مراکز، پیشہ ورانہ اور لینگوج تھراپی، تربیت یافتہ پیشہ ور افراد اس کی کامیابی کے لیے لازمی شرط ہیں۔

قومی پالیسی برائے تعلیم 2020: ہدف ۴ (ایس ڈی جی ۴) کے 2030 کا ایجنڈا ہے

کہ" شمولیاتی اور مساوی معیاری تعلیم کو یقینی بنانا اور سب کے لیے زندگی بھر سیکھنے کے مواقع کو فروغ دینا۔ نظام تعلیم کا مقصد اچھے انسانوں کو تیار کرنا ہے جو باشعور سوچ اور عمل کے اہل ہوں، رحم اور ہمدردی، ہمت اور نرمی، سائنسی مزاج اور تخلیقی تخیل کے ساتھ اخلاقی اقدار کے حامل ہوں۔ اس کا مقصد شہریوں کو تیار کرنا ہے جو کہ منصفانہ، جامع اور کثیر معاشرہ کی تعمیر کے لیے مصروف، نتیجہ خیز، اور تعاون کرنے والے اور ان ہی کو ہمارا آئین نے تسلیم کرتا ہے۔ تو اس فروغ کے لیے اچھے تعلیمی اداروں کی ضرورت ہے اور اچھا تعلیمی ادارہ وہ ہوتا ہے جس میں ہر طالب علم کو خوش آمدید کہا جائے اور ان کی دیکھ بھال کی جائے، جہاں پر ایک محفوظ اور حوصلہ بڑھانے والا سیکھنے کا ماحول ہو، جہاں مختلف سیکھنے کے تجربات مہیا ہوں اور جہاں اچھا بنیادی ڈھانچہ اور سیکھنے کے لیے موزوں وسائل دستیاب ہوں۔ بہتر تعلیم کے حصول کی کے کے لیے پہلی ضرورت یہ ہوگی کہ اسکولوں میں بنیادی ضروریات، مناسب اور محفوظ انفراسٹرکچر، کھیل اور تفریحی وسائل جیسے مہذب اور خوشگوار سروس کے حالات کو یقینی بنایا جائے۔ انھیں تمام جنسوں کے بچوں اور معذور بچوں کے لیے ایک محفوظ، جامع اور موثر تعلیمی ماحول حاصل کرنے کے لیے خوش ہونا چاہیے۔
ایسے ماحول کو تیار کرنا کہ تمام طلبہ کی دیکھ بھال کے ساتھ ان کی ثقافت شمولیت بھی یقینی ہو۔ مساوی اور شمولیاتی تعلیم: سب کے لیے سیکھنا اس سیکشن میں درج ذیل نکات پر توجہ مرکوز کی گئی ہے:

تعلیم وہ واحد سب سے بڑا ذریعہ ہے سماجی انصاف اور مساوات (اکوٹی) کو حاصل کرنے کا۔ شمولیاتی یا جامع اور مساوی تعلیم حقیقتاً اپنے حق کے اعتبار سے ایک ضروری مقصد ہے۔ ایک جامع اور مساوی معاشرے کے حصول کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں ہر شہری کو خواب دیکھنے، ترقی کرنے اور قوم کے لیے اپنی حصہ داری کا موقع ملے۔ یہ پالیسی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ اسکولی تعلیم میں رسائی، شرکت اور سیکھنے کے نتائج میں سماجی زمرے کے فرق کو ختم کیا جائے۔ حکومت ہند ملک کی صلاحیت کو

بڑھانے کے لیے ایک جینڈر۔انکلوژن فنڈ' تشکیل دے گیتا کہ تمام لڑکیوں کے ساتھ ساتھ ٹرانس جینڈر طلبہ کے لیے مساوی معیار کی تعلیم فراہم کی جا سکے۔

مفت بورڈنگ کی سہولیات تعمیر کی جائیں گی جیسے ایڈیشنل جواہر نوودیا ودیالیاس اور کیندریہ ودیالیاس پورے ملک میں تعمیر کیے جائیں گے، خاص طور پر خواہش مند اضلاع، خصوصی تعلیمی زونز اور دیگر پسماندہ علاقوں میں، تاکہ اعلیٰ معیار کے تعلیمی مواقعوں میں اضافہ ہو۔ای سی ای میں معذور بچوں کی شمولیت اور مساوی شرکت کو یقینی بنانا اور اسکولنگ سسٹم کو بھی اولین ترجیح دی جائے گی۔معذور بچوں کو بنیادی مرحلے سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک باقاعدہ اسکولنگ کے عمل میں مکمل طور پر حصہ لینے کے قابل بنایا جائے گا۔اس مقصد کے لیے، اسکولوں/ اسکول کمپلیکس کو معذور بچوں کو مرباط کرنے، کراس ڈس ایبلٹی ٹریننگ کے ساتھ خصوصی معلمین کی بھرتی، اور جہاں بھی ضرورت ہو، وسائل کے مراکز کے قیام کے لیے وسائل فراہم کیے جائیں گے، خاص طور پر شدید یا ایک سے زیادہ معذوری والے بچوں کے لیے۔آر پی ڈبلیو ڈی ایکٹ کے کے مطابق تمام معذور بچوں کے لیے رکاوٹ سے پاک رسائی کو نحال کیا جائے۔معذور بچوں کی مختلف اقسام کے مطابق مختلف ضروریات ہوتی ہیں۔اسکول اور اسکول کمپلیکس تمام معذور بچوں کو ایکوموڈیشن فراہم کرنے کے لیے کام کریں گے اور اس کے لیے ان کی مدد کی جائے گی تاکہ بچوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تیار ممکن ہو سکے اور کلاس روم میں ان کی مکمل شرکت اور شمولیت کو یقینی بنایا جا سکے۔خاص طور پر، معاون آلات اور مناسب ٹیکنالوجی پر مبنی اعلات، نیز مناسب اور زبان کے لیے موزوں تدریسی مواد (مثلاً، بڑے پرنٹ اور بریل میں نصابی کتب) دستیاب کرائی جائیں تاکہ معذور بچوں کو آسانی سے مربوط ہونے میں مدد ملے۔کلاس میں جائیں اور اساتذہ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ این ای او ایس ہندوستانی علاماتی زبان سکھانے اور ہندوستانی اشاروں کی زبان کا استعمال کرتے ہوئے دیگر بنیادی مضامین سکھانے کے لیے اعلیٰ

معیار کے ماڈیول تیار کرے۔ معذور بچوں کی حفاظت اور حفاظت پر خاطر خواہ توجہ دی جائے گی۔ آر پی ڈبلیو ڈی ایکٹ کے مطابق بینچ مارک معذوری والے بچوں کے پاس باقاعدہ یا خصوصی اسکولنگ کا انتخاب ہونا چاہیے۔ وسائل کے مراکز خصوصی معلمین کے ساتھ مل کر شدید یا ایک سے زیادہ معذوری والے سیکھنے والوں کی بحالی اور تعلیمی ضروریات میں مدد فراہم کریں گے اور والدین/سرپرستوں کی مدد کریں گے کہ وہ اعلیٰ معیار کی ہوم اسکولنگ اور ضرورت کے مطابق ایسے طلبہ کے لیے ہنر سیکھنے میں مدد کریں۔ شدید اور شدید معذوری والے بچوں کے لیے جو اسکول نہیں جا پاتے ہیں، ہوم اسکولنگ یا گھریلو تعلیم ایک اچھا انتخاب رہے گا۔

تمام معذور بچوں کی تعلیم ریاست کی ذمہ داری ہے، ٹکنالوجی پر مبنی حل والدین اور دیکھ بھال کرنے والوں کی واقفیت کے ساتھ ساتھ سیکھنے کے مواد کی وسیع پیمانے پر تقسیم کے لیے استعمال کیے جائیں گے تاکہ والدین اور دیکھ بھال کرنے والوں کو اپنے بچوں کی سیکھنے کی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل بنایا جا سکے۔

مناسب تشخیص اور سرٹیفکیشن کے لیے ایک ماحولیاتی نظام بنانا: تشخیص اور سرٹیفکیشن ایجنسیاں، نیا نیشنل اسسمنٹ سنٹر پرکھ، رہنما دستاویز تیار کریں گے اور اس طرح کے جائزے کے انعقاد کے لیے، بنیادی مرحلے سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک (بشمول داخلہ امتحانات) کے لیے مناسب ٹولز کی سفارش کریں گی، تاکہ سب کے لیے مساوی رسائی اور مواقع کو یقینی بنایا جا سکے، طلبہ سیکھنے کی معذوری کے ساتھ۔ مخصوص ضرورت کے حامل (بشمول سیکھنے کی معذوری) والے بچوں کو کیسے پڑھایا جائے، اس بارے میں آگاہی اور علم اساتذہ کی تعلیم کے تمام پروگراموں کا ایک لازمی حصہ ہوگا، اعلیٰ تعلیم میں، خاص مضامین میں مالی مدد جیسے سائنس، ریاضی، سماجی علوم، ہندی، انگریزی، ریاستی زبانیں، یا نصاب یا دیگر متعلقہ مضامین کو نصاب میں شامل کرنا، اسکولوں کے مطابق۔ لائبریریوں اور لیبارٹریوں کو مضبوط کیا جائے گا اور پڑھنے کے لیے مناسب مواد جیسے کتابیں، جرائد

وغیرہ اور دیگر تدریسی مواد دستیاب کرایا جائے گا۔این سی سی کی مدد سے طلباء کی قدرتی صلاحیتوں اور منفرد صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے گی۔شمولیت اور مساوات اساتذہ کی تعلیم کا کلیدی پہلو بن جائے گا۔اسکول کے نصاب میں، ابتدائی طور پر، انسانی اقدار جیسے تمام افراد کا احترام، ہمدردی، رواداری، انسانی حقوق، صنفی مساوات، عدم تشدد، عالمی شہریت، شمولیت، اور مساوات شامل ہوں گے۔ اس میں مختلف ثقافتوں، مذاہب، زبانوں، صنفی شناخت وغیرہ کے بارے میں مزید تفصیلی معلومات بھی شامل ہو گی تا کہ تنوع کے احترام کو حساس بنایا جا سکے۔اعلیٰ تعلیم میں نصاب، کو زیادہ شمولیاتی بنایا جائے، مزید نوکریاں ہوں، اور ڈگری کورس ہندوستانی زبانوں میں پڑھائے جائیں، بنا رکاوٹ کی عمارتیں ہوں، سماجی اور جزباتی امداد ہو اور سیکھانے والے حساس ہوں۔مخصوص ضرورت کے حامل طلبہ کے لیے شمولیاتی تعلیم مہیا کرانا، ایک اہم مداخلت یا انٹرو ینشن رہی ہے شروعاتی سروشکشا ابھیان، ارایم ایس اے اور ارٹی ای کی۔2018 تا 2019 سے، سماگرا شکشا نرسری سے بارہویں جماعت کے تمام طلباء کے لیے تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے پر زور، جس میں مخصوص ضرورت کے حامل طلبہ بھی شامل ہیں۔انٹرو ینشن اس کا بہت اہم جزو ہے۔ یہ مختلف مخصوص ضرورت کے حامل طلبہ کے لیے شناخت، تشخیص، آلات، اصلاحی سرگرمیاں، یونیفارم، بریل کتابیں، بڑی پرنٹ کتابیں اور یونیفارم، علاج کی خدمات، سی ڈبلیو ایس این کی فطرت اور ضروریات کے بارے میں مثبت رویہ اور آگاہی پیدا کرنے کے لیے ساز وسامان، ماحولیات کی تعمیر اور واقفیت کا پروگرام، تدریسی مواد کی خریداری/ترقی، نصاب کے موافقت پر خصوصی اساتذہ اور عام اساتذہ کی خدمت میں تربیت، خصوصی ضروریات والی لڑکیوں کے لیے وظیفہ وغیرہ (سماگرا شکشا، ڈی ایس ای ایل، جی او آئی)۔

Bibliography

- ASSISTIVE TECHNOLOGY AND TITLE II AND TITLE III

Retrieved from.(March2014,)OF the American with Disability Act.

:DISABILITY RIGHTS NETWORK of PENNSYLVANIYA
www.disabilityrightspa.org

- Retrieved from.(Dec 232009,)Definition of disability. Disabled
- Education and(2002)Hegarty, Seamus, and MithuAlur, From Segregation to Inclusion,:Children with Special Needs Sage Publications:Thousand Oaks, Calif
- Inclusive Education in India:A Country in.(2012)Kohama, A. Transition. An undergraduate Honors Thesis presented to the Department of International studies at the University of Oregon.
- Marriam Webster. Retrieved.(since 1828)Marriam Webster. /www.merriam-webster.com//:from https
- Education of Children.(2012)MondalAjit& Mete, Jayanta. :Concern and Policy Perspective.with Disabilities in India www.aracy.org.au/publications.
- From Special Education to Inclusive.(n.d.)Pandey, Y. Education:An Analysis of Indian Policy. Banaras Hindu University,.
- Education of children with special.(2006)Rajakumar, P. e. needs. In et.al, position paper national focus group on Education of National Council of:children with special needs. New Delhi Educational Research and Training.
- THE RIGHTS OF PERSONS.(December 272016,)RPWD. :Delhi, India.WITH DISABILITIES ACT. The Gazette of India MINISTRY OF LAW AND JUSTICE.
- Education of children with disabilities in.(2009)Singal, D. N.

India, Background paper prepared for the Education for All Global

43._UNESCO, 1Monitoring Report 2010.

Special Needs Education.(Dec 62007,)Tremblay, P. •

:Basis:Historical and Conceptual Approach. PPT. Tivat, Montenegro

.UniversitéLibredeBruxelles

The Salamanca Statement and.(1994)UNESCO. •

Framework for Action. UNESCO Special Education, Division of

Basic Education Geneva.

focusing:From integration to inclusion.(2003)VISLIE, L. •

global trends and changes in the western European societies. Eur.

pp. 17–35.,(1)J. of Special Needs Education, Vol. 18,

Exceptional Children an introduction to.(2010)W.L.Heward. •

Special Education. Pearson Allyn Bacon Prentice Hall.

:world towards tomorrow •

www.disabled-world.com/definitions/disability-definitions.php//:https

www.ccdisabilities.nic.in/actsguideline/pwd-act-1995//:http •

dsel.education.gov.in/scheme/samagra-shiksha//:https •

samagra.education.gov.in/inclusive.html//:https

sustainabledevelopment.un.org/content/documents/1681Dakar%20Framework%20for%20Action.pdf//:h

www.childrensrights.ie/sites/default/files/information_sheets/files/SummaryUNCRC.pdf//:vikaspedia.in/s

/www.humanium.org/en/world-declaration-on-education-for-all//:https

www.un.org/development/desa/disabilities/standard-rules-on-the-equalization-of-opportunities-for-perso

www.un.org/en/about-us/universal-declaration-of-human-rights//:https

www.yourarticlelibrary.com/education/the-sargent-report-objects-criticism-and-defects-education/89644/

☆☆☆

Iqbal aur Goethe by Dr. Naim Raza (Asst. Prof. dept. of Urdu, Sub divisional govt. degree college, Baisi, Purnia)cell-7004586921
ڈاکٹر نعیم رضا (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ ءاردو، سب ڈویژنل گورنمنٹ ڈگری کالج، بائسی، پورنیہ)

اقبال اور گوئٹے

علامہ اقبال کی فکر و شخصیت پر شروع سے اسلامی و قرآنی چھاپ پڑی ہوئی ہے, اس لیے وہ ہر اس تحریک اور شخصیت سے متاثر رہے, جو قرآن و سنت سے ہم آہنگ ہو۔ اقبال کی شاعری کے تانے بانے بُننے میں گوئٹے کی فکر و شخصیت نے بھی بڑا رول ادا کیا ہے۔ لہٰذا اقبال کی شاعری کے ادبی پس منظر کا اندازہ لگانے کے لیے گوئٹے اور اقبال کی فکری یکسانیت کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ گوئٹے ایک شاعر اور مفکر کی حیثیت سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ ایک تو وہ دل بستگی ہے جو گوئٹے کو مشرقی دنیا سے عموما اور عالم اسلام سے خصوصاً تھی اور دوسری وہ عقیدت جو ہمارے سب سے بڑے شاعر اور مفکر ڈاکٹر اقبال کو گوئٹے اور اس کے کلام سے تھی۔ یورپ کی ادبی تاریخ میں کوئی شخص شاید ہی ایسا ملے گا جس نے مشرق اور مغرب کے باہمی تعلق کو گوئٹے کی سی بصیرت اندوز نگاہ سے دیکھا ہو۔ جہاں انگلستان کا مشہور استعمار پرست شاعر رڈیارڈ کپلنگ مشرق اور مغرب کو ایک دوسرے سے بالکل الگ تصور کرتا اور اُن کا آپس میں ملنا ناممکن سمجھتا ہے، وہاں انسان دوست گوئے کہتا ہے:

"جو شخص اپنے آپ کو جانتا اور دوسروں کو پہچانتا ہو، وہ یہ بھی آسانی سے سمجھ سکے گا کہ مشرق اور مغرب ایک دوسرے سے قطعاً جدا نہیں ہیں۔"

گوئٹے کی طبیعت یورپ کی سیاسی بدامنی اور روحانی افلاس سے بیزار ہوتی تو اُس کا تخیل مشرق کی پُر امن اور پُر سکون فضا کی طرف اپنا پر پھیلانے لگتا۔ چنانچہ "دیوان

شرقی" کی پہلی نظم ہجرت کے پہلے بند کے شعر ہیں:

شمال، جنوب اور مغرب ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں، تخت و تاج پاش پاش ہونے کو ہیں, سلطنتیں لرز رہی ہیں۔ آؤ ہم مشرق کی پاک فضاؤں کی طرف چلیں اور پیرانِ شرق کی صحبت سے فیض یاب ہوں۔ گوئٹے نے قرآن، سیرت رسول ؟ اور تعلمیاتِ اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ قرآن سے بہت متاثر تھا۔ قرآن کی دوسری سورت یعنی سورہ بقرہ کے شروع کی آیات کو قرآن کا خلاصہ اور اسلام کی تعلیم کی روح سمجھتا تھا۔ اس کتاب میں اس کے لیے ایک مقناطیسی کشش تھی۔ اسی اندازِ فکر و نظر کے باعث اقبال گوئٹے کو پسند کرتے تھے اور ان کے کلام کو عزت و اعتماد کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

گوئٹے نے ایک مقام پر کہا ہے کہ اگر چہ اس کتاب (قرآن) کے مطالعے سے قاری پر عمل اور ردّ عمل دونوں کیفیتیں طاری ہوتی ہیں، لیکن وہ بار بار ہمیں اپنی جانب کھینچتی ہے اور بالآخر ہمیں اس کی عظمت کے سامنے سر جھکا دینا پڑتا ہے۔ جہاں تک سیرت رسول کا تعلق ہے، گوئٹے کی نظم "نغمہءمحمد" جو اس نے اپنی جوانی کے زمانے میں لکھی تھی، رسول اکرم کی ذات سے اس کی محبت اور عقیدت کا ایک ایسا نمونہ پیش کرتی ہے، جس کی نظیر اُردو, فارسی اور عربی کے نعتیہ کلام میں بھی مشکل سے ملے گی۔ اقبال نے اس نظم کا فارسی میں آزاد ترجمہ کیا ہے, جو "جوئے آب" کے عنوان سے "پیام مشرق" میں شامل ہے۔ حضرت محمد عربی کو بنی نوعِ انساں کی فلاح و بہبود کی جو فکر ہر وقت دامن گیر رہتی تھی اور انسان کی خدمت کے لیے وہ جس طرح بے قرار رہتے تھے، اس کی ایک دلکش تصویر ہمیں گوئٹے کی نظم میں ملتی ہے۔ اقبال کا ترجمہ ہے:

صد جوئے دشت و مرغ و کہکشاں و باغ و راغ
گفتند ای بسیط زمین با تو سازگار
ما را کہ را از تنگ آبی نہ بردایم

از دست بر در یگ بیاباں نگادار

حضرت رسول اکرم کی ساری زندگی میں تخلیقی جد و جہد کا جو بے قرار جذبہ مسلسل طور پر کارفرما تھا، اس کا پرتو اقبال کے ترجمے کے اس شعر میں ملتا ہے:

بے تاب و تند و تیز و جگر سوز و بے قرار در ہر زماں بہ تازہ رسید از کہن گذشت

گوئٹے کے "دیوان شرق" جو اس کے اواخرِ ایامِ حیات کی یادگار ہے، کے مطالعے سے اقبال اور گوئٹے کی فکری مماثلت اور ذہنی یکسانیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ گوئٹے کی اسی صداقت آمیزی اور اسلام پسندی نے اقبال کو اس سے بہت قریب کر دیا ہے اور اقبال کی فکر پر گوئٹے کی فکر اثر انداز ہوئی ہے۔ اقبال اور گوئٹے میں ایک سے زیادہ خصوصیات مشترک ہیں۔ دونوں زندگی کو آفاقی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور دونوں ظواہر سے گزر کر حقائق تک پہنچتے ہیں۔ نوعِ انسان دونوں کی نگاہ میں ایک غیر منقسم اور نا قابل تقسیم وحدت ہے۔ نہ مشرق مغرب سے جدا ہے، نہ شمال جنوب ہے۔ اقبال کی شخصیت پر جو بجائے خود مشرق و مغرب کا ایک غیر معمولی امتزاج ہے، دو بڑے ارتقائی اثرات ہیں، ایک مشرقی اور دوسرا مغربی، یعنی رومی اور گوئٹے۔ اقبال نے ان دونوں کے متعلق کہا ہے:

نیست پیغمبر ولی دارد کتاب: یہاں اس مصرع میں کتاب سے اشارہ "مثنوی مولانا روم" اور گوئٹے کی کتاب "فاؤسٹ" کی طرف ہے۔ پیامِ مشرق میں "جلال اور گوئٹے" کے عنوان سے جو نظم ہے, اس میں اقبال نے دونوں کی حقیقت بینی اور روحانی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ گوئٹے مولانا روم کو فاؤسٹ پڑھ کر سناتا ہے اور مولانا روم اس کی بصیرت کی داد دیتے ہیں:

نکتہ دانِ المنی رادر ارم صحبتی افتاد با پیرِ عجم
شاعری کو ہمچو آں عالی جناب نیست پیغمبر ولی دارد کتاب
خواند بردا نای اسرار قدیم قصہ پیمان ابلیس و حکیم
گفت رومی ای سخن راجاں نگار فکر تو در کنجِ دل خلوت گزید

تو ملک صید استی و یزداں شکار ایں جہانِ کہنہ را باز آفرید
سوز و ساز جان بی پیکر دیدئی در صدف تعبیر گوہر دیدئی
ہر کسی از رمز عشق آگانیست ہر کسی شایان ایں درگانیست
"داند آں کو نیک بخت و محرم است زیرکی زابلیس و عشق از آدم است"

نظم کا آخری شعر مولانا روم کا ہے۔اس نظم کے حاشیے میں اقبال نے "فاؤسٹ " کے متعلق مندرجہ ذیل نوٹ لکھا ہے: نکتہ داں المنی سے مراد گوئٹے ہے، جس کا ڈراما " فاؤسٹ " مشہور و معروف ہے۔اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فاؤسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشو ونما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا۔

مذکورہ بالا تصریحات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ کہ فکری طور پر اقبال جس طرح رومی سے متاثر تھے ,اسی طرح گوئٹے سے بھی متاثر تھے۔گوئٹے کے علاوہ اقبال نے مذکورہ شخصیات (حافظ و نظیری و رومی و غالب ,داغ دہلوی) کے علاوہ اور بھی بہت سے مشرقی و مغربی مفکرین کا مطالعہ کیا ہے اور ان سے اثر بھی قبول کیا ہے۔البتہ مذکورہ بالا افراد و عناصر نے اقبال کی زندگی اور فکر کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اور ان کے نظامِ شعر و سخن پر اثر انداز ہوئے ہیں۔اقبال کی شاعری کے ادبی پس منظر کو سمجھنے کے لیے اس جہت کو ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ایک دانشور نے سچ کہا ہے کہ " داغ کی غزل گوئی، غالب کے اسلوب بیان، حافظ شیرازی کی غنائیت و سرمستی ،نظیری و بیدل کی فارسی گوئی، ایمان و یقین کی قوت ،قرانی پیغام کی بلندی و افاقیت ،سحر خیزی کی دولت و برکت ،مجدد الف ثانی کی ایمانی جرت و عزیمت اور رومی کے عشق کو ملا کر جب ایک خمیر تیار کیا جائے تو اس سے ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ مفکر شاعر پیدا ہوتا ہے جس کو دنیا علامہ اقبال کے نام سے جانتی ہے"۔

☆☆☆

Mohd. Hafeez : Maqbool Afsana Nigar by Dr.Parween Khanam

(Darbhanga) cell-8292841633

ڈاکٹر پروین خانم (دربھنگہ)

محمد حفیظ: مقبول افسانہ نگار

محمد حفیظ مقبول افسانہ نگار تھے۔ ان کا پہلا افسانہ ''پڑھو'' سنگم، پٹنہ میں ۲/ مارچ سن ۱۹۵۴ء کو شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کے ۱۶۷/ افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ جس میں زندگی اور زندگی کی واقعیت کو حقیقت نگاری کی ٹھوس شکل میں پیش کیا گیا ہے جس سے سماجی شعور اور اصلاح پسندی کا جذبہ بڑھے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ''پسماندگی کا بوجھ'' (۱۹۶۳ء)، نئی سوچ (۱۹۶۴ء) اور جدیدیت کے مقاصد (۱۹۶۵ء) میں شائع ہو چکے ہیں۔ جس میں سماجی مسائل کے ساتھ عوامی زندگی کی تصویر کشی ملتی ہے۔ وہ سادہ، سلیس اور شفاف زبان میں پلاٹ، کردار، ماحول اور نقطۂ نظر کو دلکش اور خوش نما انداز میں پیش کرنے میں ماہر فنکار تھے۔ ان کے افسانوں کا اختتام دل پر گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ ان کے افسانے دہکتی لاشیں، دلہن کے آنسو، آج کی شادی، جیل کی سلاخیں، وطن کے لئے قربانی، مجھے بچاؤ، انصاف کی دہلیز، جہالت، فاقہ کشی، ماں کی تمنا، رشوت، قرض، دلہن کا جنازہ، ضمیر فروش وغیرہ کو مختصر میں سادگی اور دلکشی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ جس میں کہانی پن کا التزام بہت شدت اور شعوری طور پر کیا گیا ہے جو افسانہ نگار کی انفرادیت ہے۔ ان کے افسانے، افسانچے اور سائنسی افسانے میں احساسات وجذبات کو تجربات کی روشنی میں ظاہر کیا ہے۔ دور حاضر کے سلگتے مسائل، سماجی، ملکی و قانونی حالات، پسماندگی اور اخلاقی گراوٹ وغیرہ ان کے افسانوں کے محور و مرکز ہیں۔ وہ پیچیدہ موضوعات کو بھی سیدھے سادے الفاظ میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے کیونکہ انہیں زبان و بیان پر حیرت انگیز گرفت حاصل تھا جو ان کی تخلیقی صلاحیت کے روشن

نقوش ہیں۔

افسانہ آج کی شادی میں جہیز کی لمبی فہرست، کثیر تعداد میں آئے برائیوں کے عمدہ کھانوں کی قطاریں اور اعلیٰ قسم کی سجاوٹیں دلہن کے والد کو زمین بیچنے اور قرض لینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ کردار زلیخا کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ افسانہ دلہن کا جنازہ میں کردار شاہینہ کی شادی میں حسب فرمائش مانگیں پوری نہیں ہونے پر سسرال میں طعنہ کشی جھیلنی پڑتی ہے اور شوہر کی پٹائی کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ احتجاج کرنے پر اس کا گلا دبا دیا گیا جس سے اس کی موت ہوگئی۔ اس کے والد اور بھائی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں میں غریبی کا بوجھ پوشیدہ ہے جو جنازہ کے بوجھ کی وجہ ہے۔ افسانہ جیل کی سلاخیں کے کرداروں اطہر، حنیف اور رمیش کے ساتھ پولیس کی سختی و زیادتی کا ایک واحد وجہ غلامی کے خلاف آزادی کی تحریک کو فروغ دینا ہے۔ کالا پانی جیل کی سختیوں کو بھی آزادی کے نا یک خوشی خوشی جھیل رہے ہیں۔ افسانہ ہیروشیما کی تباہی کا تھیم ایٹمی بم بلاسٹ ہے۔ افسانہ ایک اور جنگ کا تھیم بھارت اور چین کے درمیان ہوئے جنگ کی عکاسی ہے۔ افسانہ پسماندگی کا بوجھ کا تھیم دلت مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی ہے۔ افسانہ سبزی فروش اور باغبان کے آنسو کا نقطۂ نظر سماج میں رائج چھوٹی ذات اور بڑی ذات کے درمیان کا ٹکراؤ ہے۔

معتبر و مقبول افسانہ نگار ماسٹر محمد حفیظ بن محمد حنیف انسانی نفسیات سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ واقعہ کو ترتیب دینے میں انہیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ ان کے کردار بھی اصل زندگی سے وابستہ ہیں۔ اصلاح کا جذبہ ہی ان کے افسانہ نویسی کا واحد مقصد ہے۔ مکالموں کے ذریعہ وہ کرداروں کے ذہنوں اور سوچ کو پیش کرنے میں ماہر ہیں۔ وہ مقامی حالات و معاملات کو اصل شکل میں سادہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا کینوس وسیع ہے۔ غریب، امیر، زمیندار، حاکم، تنگ دستی، اعلیٰ و عیش پرست رہن سہن وغیرہ کو پلاٹ، کردار اور نقطۂ نظر کے مطابق تصویر کشی میں وہ ماہر تھے۔ انسانی جذبات کی

عکاسی کی مہارت اور تھیم ان کی مقبولیت کے وجوہات ہیں۔ افسانہ پسماندگی کا دلدل کا مرکزی کردار نوری سماجی نفرت کا شکار ہے کیونکہ وہ غریب ہے لیکن اپنے عزم اور محنت سے اچھا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے جو مثبت سوچ، عزم اور محنت کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے سائنسی افسانے بھی لکھے ہیں۔ کینسر اور ڈاکٹر جینی ان کے بے حد مقبول سائنسی افسانے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ کواتر پردیش اردو اکادمی نے سال ۱۹۶۴ میں اعزاز سے نوازا تھا۔

ان کے افسانوں کا مجموعہ جدیدیت کے مقاصد پر بہار ودھان سبھا کے اسپیکر غلام سرور صاحب ۱۰/اگست ۱۹۹۰ء کو انہیں سہیل عظیم آبادی اعزاز سے نوازا تھا۔ ۱۵/ اگست ۱۹۷۱ء کو چیرمین آر۔ بی۔ جالان نے ماسٹر محمد حفیظ راعین بن محمد حنیف راعین کو ٹاؤن ہال دربھنگہ میں متھلا رتن اعزاز سے نوازا تھا۔ ان کی تصانیف اردو ادب اور ترقی پسند تحریک (۱۹۶۱ء)، مقالات نورانی (۱۹۶۲ء)، پسماندگی کا بوجھ (۱۹۶۳ء)، معاشرے میں گراوٹ (۱۹۶۳ء)، توحید کی عظمت (۱۹۶۴ء)، نئی سوچ (۱۹۶۴ء)، جدیدیت کے مقاصد (۱۹۶۵ء)، جدید سائنسی تعلیم (۱۹۶۶ء)، اردو ادب (۱۹۸۵ء)، افسانہ اور افسانہ نگاری (۱۹۸۶ء) شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ آپ کی ولادت ۲/ جنوری ۱۹۲۰ء اور وفات ۷/نومبر ۱۹۹۹ء کو ہوئی تھی۔ انجمن باغ و بہار (بھاگل پور) کے ڈاکٹر محمد پرویز نے لکھا ہے:

''اردو افسانے کی تاریخ کا ایک بہت ہی معتبر نام متھلا رتن ماسٹر محمد حفیظ بن الحاج محمد حنیف کا ہے۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، افسانچہ نگار، تنقید نگار، محقق اور شفیق استاد تھے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں مسلم معاشرہ خاص کر نچلے طبقے کے مسائل کو بڑی فنکاری سے پیش کیا ہے۔'' (بحوالہ روزنامہ ''فاروقی تنظیم'' پٹنہ، ۸/نومبر ۲۰۲۵ء، ص:۵)

پروفیسر اویس احمد دوراں نے لکھا تھا:

''محمد حفیظ ایک معروف اور مقبول ادیب، افسانچہ نگار، محقق اور استاد ہیں۔ ان کی کئی

کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ان کے علمی و ادبی تحقیقی خدمات قابل ستائش ہیں۔انہوں نے وسیع مطالعے اور مشاہدات کو مشعل راہ بنا کر ادبی اصناف پر کام کیا ہے۔ان کے افسانچوں میں معاشرے کی تصویر کشی بہت اچھے اور نمایاں انداز میں ملتی ہیں۔انہوں نے موضوعات کو عمدہ طریقے سے افسانچوں کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ان کے موضوعات میں غریبی، استحصال، سماج و ملک کے حالات ، ازدواجی رشتہ، قومی یکجہتی، ساتھ افسانچوں کا پیرہن عطا کیا ہے۔جس میں تجسس، تسلسل اور دلچسپی ہوتی ہے۔وہ ایک کامیاب ادیب اور افسانچہ نگار ہیں۔''

(روزنامہ ''سنگم''، پٹنہ، ۱۶/جنوری ۱۹۶۸ء، ص:۷)

افسانہ نگار محمد حفیظ نے ۱۶۷/افسانے لکھے ہیں۔ان کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو کر توصیف و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ان کا تعلق درس و تدریس سے رہا ہے اس لئے تحقیق و تنقید پر بھی کام کیا ہے۔ان کی شناخت اور شہرت درس و تدریس، مختلف اصناف ادب کے محقق و تخلیق کار اور اچھے افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے۔تہذیبی و ثقافتی گراوٹ، سماجی استحصال و ناہمواری، فریب کاری و دھوکا کاری، غربت و فاقہ کشی وغیرہ ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ان کے افسانے انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر محیط ہیں جنمیں چیخ، درد، کسک اور دماغی بے چینی کیفیت بھری ہوئی ہے۔وہ صرف واقعہ کو گڑھنے یا دلچسپ بنانے کے لئے افسانہ کی تشکیل نہیں کرتے بلکہ کردار کی اندرونی خوبی یا خامی کے اثرات اور اس کے نتائج کو اجاگر کرتے ہیں۔جس میں عصری حسیت اور معنویت کے تقاضوں کی عکاسی ملتی ہے۔

افسانہ نگار محمد حفیظ راعین کا ایک سائنسی افسانہ کینسر اور ڈاکٹر جنی ہے۔جرمن کی ڈاکٹر جنی کینسر پر تحقیق کر رہی ہیں اور کینسر مرض میں خود بھی مبتلا ہیں۔وہ پیٹ کے درد کو جھیلتی رہتی ہے اور تحقیق میں مصروف بھی رہتی ہے۔وہ سائیکلو فوسفائڈ، میٹن ہاڈروکلورائیڈ، کلورو بیوسل، میٹھوٹریکجٹ اور پکلک ایم سالٹ وغیرہ پر تحقیق کرتی رہتی

ہے اور عالمی سائنسدانوں کے درمیان نتائج کو پیش کرتی رہتی ہے۔ ایک جنوری کو وہ بتاتی ہے کہ اس نے کینسر مرض کی دوا ساٹکرم کھوج کی ہے جو سائیکلو فاسفامڈ سالٹ سے تیار کیا جائے گا۔ فلورو راسل سالٹ سے فیورٹر بھی بنایا جاسکتا ہے۔ یکا یک اس کے منہ سے ایک چیخ نکلتی ہے اور وہ بستر پر گر کر چھٹپٹانے لگتی ہے اور پھر سدا کے لئے خاموش ہو جاتی ہے۔ عالمی سائنسدانوں کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں۔ پھر وہ چلانے لگتے ہیں۔ یورکا، یورِکا، میں نے پالیا، میں نے پالیا، یہ سائنسی افسانچہ اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ منفرد انداز کا افسانچہ ہے جو سائنسی تحقیق کے مطابق ہے۔ جسے دانشوروں نے خوب پسند کیا ہے۔ اس سے افسانچہ نگار نے یہ درس دیا ہے کہ مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں مسلسل کوششیں کرنی ہوگی۔ ہر سائنسی تحقیق کافی محنتوں کے بعد نتائج کی شکل میں رونما ہوتی ہے جس سے ہم مستفیض ہو پاتے ہیں اور ترقی کی راہ پر منزل در منزل آگے بڑھتے ہیں۔ اس افسانچہ کا پلاٹ بہت سادہ ہے اور پیچیدگی نہیں ہے۔ ڈاکٹر جنی کا کردار حقیقی اور اصلی ہے۔ افسانہ کا نقطۂ نظر کینسر کی بیماری پر تحقیق ہے۔ ڈاکٹر جنی کی علمی صلاحیت، مقصد کی حصولیابی کی کاوشیں اور لگن کے سامنے اس کا درد بھی اسے روک نہیں پاتا۔ موت سے قبل وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ لیبوریٹری کی فضا اور سائنسدانوں کی موجودگی سائنسی ماحول اور فضا کو پیش کرتی ہے۔ افسانہ کی زبان سیدھا، سادا، سہل، شگفتہ اور دلنشیں ہے۔ سائنسی افسانچہ سے متاثر ہو کر افسانہ نگار محمد صفی الرحمن نے افسانچہ وکٹری لکھا ہے۔ اس کا مرکزی کردار سرجن اکبر ہے۔ اس کے والد تیز بخار، کھانسی، قے، نزلہ وزکام کے شکار ہوئے جس سے سبھی فکرمند ہوئے۔ کرونا کی دہشت کی وجہ سے گھر کے افراد روتے رہتے جبکہ ڈاکٹر اکبر بے فکر و مطمئن رہتے۔ بارہویں دن بیمار ظہیر ٹھیک ہو گئے۔ اس خبر سے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انڈین سائنس کانگریس کے ڈاکٹر ماتھر بھی ملنے آئے اور خوشی کا اظہار کیا۔ واپسی میں انہوں نے دیکھا کہ ایک بچی ٹبلیٹ پاراکوئن ۔ ۵۰۰ ایم جی اور ٹیبلٹ ہائڈروکسی کلوروکوئن ۔ ۱۰۰/ایم۔ جی کے خالی پیکٹوں

سے کھیل رہی ہے۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر ماتھر خوش ہوئے اور وہ بد بدائے کہ وکٹری کی وجہ یہ دوائیاں ہیں۔ اس سائنسی افسانچہ کا ذکر دیپنڈ امک سنچوری کے صفحہ ۸۶ ر پر لندن کے مارک ہونگس باؤم اور اسٹین ٹیلر نے بھی کیا ہے۔ افسانچہ وکٹری فنی لحاظ سے معیاری ہے۔ افسانچہ نگار محمد صفی الرحمن کلائمکس کو ہنر مندی سے پیش کرنے میں ماہر ہیں۔ ان کا انداز تحریر دلکش اور سیدھا سادہ ہے۔ وکٹری سائنسی معلومات اور جدید حالات کی جھلک پیش کرتے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ نکولائی کی یاد ہے۔ مجید ورنڈ مڈل اسکول (دربھنگہ) سے ساتویں جماعت پاس کرنے کے بعد اپنے والد انجینئر مقبول کے پاس لندن چلا گیا۔ وہاں ہار ورڈ سے ایم ۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کر وکٹوریہ اسپتال میں بطور ڈاکٹر خدمت انجام دینے لگا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ شاہ سوپن (دربھنگہ) واپس آیا۔ گھر میں بہن کانہ میں چاول، ارہر کا دل اور بیگن کی سبزی لے کر آئی جسے اسے نے کھایا۔ شام کو وہ مصرف بازار گیا۔ وہاں اس نے بڑی، کچری کھایا اور ستتو پینے کے بعد اس نے چائے کا آرڈر دیا۔ چائے مٹی کے کولہر میں آیا۔ بڑی، کچڑی، ستتو اور مٹی کے کولہر سے اسے نکولائی کی یاد آئی جو کہہ رہا ہے کہ تاریخ دہرائی جاتی ہے۔

افسانہ نگار محمد حفیظ کے سائنسی افسانے نے کئی افسانہ نگارون کو ایک نئی سمت اور سائنسی موضوع کی فکر ورائج کیا۔ جو سائنسی علمی معلومات کو اہل ذوق تک پہنچانے کا ایک ادبی ذریعہ ہے۔ انہوں نے اپنے مشاہدات، وسیع مطالعہ اور نئے فکر کو اس ادبی صنف میں پیش کیا ہے۔ اس نئے تھیم سے بھی اہل ذوق لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ افسانہ نگار محمد حفیظ نے زندگی کے مختلف موضوعات کو اچھے انداز میں سلیقے سے افسانوی سانچے میں ڈھالا ہے اور دیگر افسانہ نگاروں کو بھی متاثر کیا ہے۔

افسانہ نگار محمد حفیظ کے افسانوں کا مجموعہ پسماندگی کا بوجھ، نئی سوچ اور جدیدیت کے مقاصد ہمیں سماجی زندگی کے حقائق کو افسانوی انداز میں روشناس کراتی ہیں اور کرداروں کے ذہن سے نقش ابھارنے میں کامیاب ہے۔ جاذبیت، فن، تکنیک

اور موضوع کے لحاظ سے سبھی افسانے تخلیقی صفات سے مزین ہیں۔جس سے افسانہ نگار کی ذہانت ،علمی لیاقت اور افسانہ نگاری پر دسترس کا پتہ چلتا ہے۔کردار کی جلوہ گری اور موضوع کو منکشف کرنے میں وہ کامیاب ہیں۔ان کی سوچ زندگی کے داخلی و خارجی پہلوؤں کو افسانوی کرداروں کے ذریعہ رونما ہوتی رہی ہے۔ان کے اندر عصری مسائل کا درد ہے جو افسانوی کردار کے ذریعہ انوکھے اور معنوی گہرائی و گیرائی کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ان کی دس تخلیقات سے ان کی زرخیزی اور ادبی اصناف سے دلچسپی و وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ان کی تخلیقات ترقی پسند تحریک ، مقالات نورانی ، معاشرے میں گراوٹ ،توحید کی عظمت ، جدید سائنسی تعلیم ، اردو ادب وغیرہ میں شامل مضامین میں علمی شناخت کے نقوش ملتے ہیں۔ان کی کتابیں مطالعے کی دعوت دیتی ہیں جو وقت کا اہم تقاضہ ہے۔

☆☆☆

Mahnama Alami Zaban (Laulak No.) ek Maroozi Mutala by Dr. Syed Humayun Akhtar (Khanqaah Shah Arzani, Patna)cell-7903615345

ڈاکٹر سید ہمایوں اختر (خانقاہ شاہ ارزانی، پٹنہ)

ماہنامہ عالمی زبان (لولاک نمبر)
ایک معروضی جائزہ

''عالمی زبان'' کے خصوصی شمارہ ''لولاک نمبر'' کا رسم اجراء عظیم آباد کے قدیم خانقاہ دیوان شاہ ارزانی، پٹنہ اور ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، کے اشتراک سے ''اردو میں عقیدت مندانہ شاعری'' کے عنوان سے منعقدہ ایک قومی سمینار میں بتاریخ 28,29 دسمبر 2025 کو ہوا تھا جس میں ہندی، اردو شعر و ادب کے معتبر حضرات نے شرکت کی تھی۔

سجادہ نشیں پروفیسر سید شاہ حسین احمد صاحب، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر احمد محفوظ، ڈاکٹر انوپم تیواری، پروفیسر جانکی پرساد شرما، پروفیسر حدیث انصاری، پروفیسر اقبال حسن آزاد، پروفیسر زین رامش، پروفیسر سراج اجملی، ڈاکٹر ریحان غنی، جناب خورشید اکبر، جناب افضل حسین، ڈاکٹر سید ہمایوں اختر، ڈاکٹر نثار احمد فیضی، پروفیسر اے مالوی، سیدہ جنیفر رضوی، پروفیسر زرینہ زرّیں، نشاط پروین، پروفیسر مظہر عالم صدیقی، پروفیسر مشکور معینی، پروفیسر جاوید اختر، پروفیسر محمد توقیر عالم، پروفیسر شہاب ظفر اعظمی، پروفیسر ابوبکر رضوی، ڈاکٹر احمد صغیر، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر زرنگار یاسمین، ڈاکٹر انور خان، پروفیسر فیروز عالم، محمد ایوب خان، منہاج انصاری، ذیشان احمد، نظیر احمد خان وغیرہ۔

اردو ماہنامہ مجلّہ ''عالمی زبان'' صوبہ مدھیہ پردیش سے شائع ہوتا ہے جس کے مدیر اعلیٰ سیفی سرونجی ہیں۔ ویسے تو وطن عزیز میں ہر ماہ سینکڑوں سے زیادہ اردو رسالے

نکلتے رہے ہیں۔لیکن میری نظر میں اس رسالے کی دو اہم ترین خصوصیت ہے۔پہلی خصوصیت یہ ہے کہ موجودہ دَور میں مدھیہ پردیش جیسے اردو زبان کے لئے سنگلاخ زمین میں ایک معیاری اردو رسالہ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔یہ سیفی سرونجی صاحب کا ہمّت مردانہ ہے کہ وہاں سے ''عالمی زبان'' جیسا معیاری رسالہ کامیابی کے ساتھ نکال رہے ہیں۔اس شمارے کی دوسری انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک خصوصی شمارہ ہے جو لولاک نمبر ہے۔اردو کے باذوق قارئین کے سامنے یہ نکتہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ''لولاک'' سیرت النبی صعلم کی ایک منظوم تصنیف ہے جس کے مصنف اردو کے معروف شاعر اور ادیب چندر بھان خیال ہیں۔حضور صعلم کے چند اہم ترین معجزات میں سے ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ اہل ایمان کے علاوہ غیر مسلم حضرات نے بھی حضور صلعم کی ذات گرامی کے ساتھ اپنی تحریروں کے ذریعہ عقیدت کا اظہار کیا ہے بلکہ اردو کے غیر مسلم شعراء نے بھی کثیر تعداد میں نعتیں لکھی ہیں ۔لیکن جناب چندر بھان خیال کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ انہوں نے منظوم سیرت کی شکل میں باضابطہ ایک تصنیف پیش کردی ہے۔اس کے لئے خیال صاحب لائق تحسین ہیں۔

جہاں تک ''لولاک نمبر'' کے اس شمارے کی بات ہے تو یہ 186 صفحات پر مشتمل کتابی شکل میں ہے۔سرورق بھی خاصا دیدہ زیب ہے۔موضوع کے اعتبار سے یہ رسالہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ''لولاک'' سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے جو 163 صفحات پر محیط ہے۔بقیہ 21 صفحات میں عام شماروں کے روایتی مشمولات ہیں۔

لولاک نمبر کے مشمولات میں چھتیس مقالے شامل ہیں جن میں مقالہ نگاروں نے مختلف زاویوں سے ''لولاک'' کا علمی انداز میں عقیدت مندانہ جائزہ پیش کیا ہے۔ان مقالہ نگاروں میں ایک الٰہ آباد کے ششانت چٹوپادھیائے بھی ہیں جنہوں نے حضور صلعم سے غایت عقیدت کے ساتھ ''لولاک'' کا معروضی وتحقیقی جائزہ پیش کیا ہے ۔ چنانچہ ششانت جی نے اپنے مقالے میں عقیدت میں ڈوب کر یوں لکھا ہے جو محل نظر ہے:

''لولاک، نہ صرف نعتیہ شاعری کا ایک بے مثال نمونہ ہے بلکہ عہد حاضر میں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت وفکر کو لوگوں تک پہنچانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔عقیدت کے ساتھ جب محبت ہم آہنگ ہوتی ہے تب قلم سے 'لولاک' جیسی نظم صفحہ قرطاس پر اترتی ہے، ایک اور اہم پہلو ہے، رسول صلعم کے افکار وذات کو سمجھنا نہایت مشکل ہے جو بلاشبہ چندر بھان خیال نے بخوبی سمجھا ہے۔لولاک نظم 2002 میں منظر عام پر آئی اور تب سے اب تک اردو ادب کے تمام معروف نقاد وادیبوں نے اس پر اپنے تاثرات وخیالات کا اظہار کیا ہے۔نظم کی بلندی اس بات سے نمایاں ہے کہ ہر قلم کار نے اسے سرآنکھوں پر بٹھایا ہے۔''

''لولاک'' کے حوالے سے مذکورہ بالا اقتباس مغز کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کا مقالہ گرچہ مختصر ہے مگر جامع ہے۔رسالہ کے آغاز میں فہرست مشمولات کے صفحہ پر کوثر صدیقی نے لولاک کے مصنف چندر بھان خیال کی شان میں رباعیات کی شکل میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔بعدازاں ''اپنی بات'' کے تحت سیفی سرونجی نے مختصر مگر جامع اداریہ پیش کیا ہے۔اس کے بعد ایک صفحہ پر مشتمل چندر بھان خیال کا ایک مختصر سوانحی خاکہ ہے پھر چندر بھان خیال کی طویل آپ بیتی ہے جو 17 صفحات پر مشتمل ہے۔اس آپ بیتی میں خیال نے اپنی علمی وادبی زندگی کے حالات تفصیل سے پیش کئے ہیں جس سے موصوف کی ادبی زندگی کا ایک مجموعی نقشہ سامنے آجاتا ہے جس میں ان کے ادبی اسفار بھی شامل ہیں۔یوں تو خصوصی نمبر میں شامل تمام مقالات اپنی جگہ پر تنقید وتحقیق کا ایک بہترین مرقع ہیں۔لیکن خاص طور سے سید تقی عابدی کا مقالہ بعنوان ''لولاک کا تیسرا دلکش حصہ: نبوت'' ہے۔اس مقالے میں مقالہ نگار نے خیال کے خیالات کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ شاعر کی فکری تازگی کا کرشمہ ہے کہ مطالب خشک اور مشکل ہونے کے باوجود مصرعوں میں گل تر کی رنگینی اور خوشبو سے معطر ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ اشعار اپنی سادگی، سلاست، روانی، شگفتگی، جذبات کی فراوانی اور نغمگی سے لبریز بھی ہیں اور یہ ہنر

شاعر کی قادرالکلامی کا نمونہ ہیں۔سیفی سرونجی کا مقالہ بعنوان ''لولاک: چندر بھان خیال کا ایک تخلیقی کارنامہ'' ہے۔اپنے اس مقالے میں ''لولاک'' کے تیسرے باب یعنی نبوت، مکی زندگی اور ہجرت تک کے واقعات کو ''لولاک'' کے اشعار کے حوالے سے پیش کیا ہے مثلاً یہ کہ مکی زندگی میں حضور پاک صلعم کی صبر، حکمت، حضرت علیؓ کو اہل مکّہ کی امانتیں دے کر رات کے وقت حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ ہجرت کرنا وغیرہ ایسے تفصیلی واقعات ہیں جس کو نظم کرنے کے لئے آنحضور صلعم کی پوری زندگی کا گہرا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔اس ضمن میں مقالہ نگار نے چندر بھان خیال کے سیرت کے مطالعے کی وسعت کا تہہ دل سے اعتراف کیا ہے۔ان مقالوں میں ایک مقالہ معتبر ادیب ڈاکٹر پرویز شہریار (این۔سی۔ای۔آر۔ٹی، نئی دہلی) کا ہے جس میں انہوں نے ''لولاک'' کے تکنیکی پہلو پر بحث کرتے ہوئے اس نظم کے بحروں اور مصرعوں کا جائزہ لیا ہے جو بہت ہی قابل تعریف ہے۔اس رسالے میں ''لولاک'' کے ایک باب نبوت کا متن بھی پیش کیا گیا ہے جو قارئین کی دلچسپی کا سامان ہے جس سے لولاک کے اصل متن کی جھلک نمایاں ہوکر سامنے آتی ہے۔علاوہ ازیں اس رسالے میں خیال کے معاصر ادیبوں اور نقادوں کے تاثرات بھی پیش کئے گئے ہیں جو تقریباً سب کے سب ''لولاک'' کے حوالے سے ہیں۔

مجموعی طور پر ''عالمی ادب'' کا یہ خصوصی شمارہ لولاک نمبر چندر بھان خیال کی تخلیق ''لولاک'' کا ایک مکمل جائزہ اور تجزیہ ہے جو اپنے آپ میں دستاویزی نوعیت کا شمارہ ہے جو آنے والے وقت میں ''لولاک'' پر تحقیق و تجزیہ کرنے والوں کے لئے حوالے کا کام کرے گا۔توقع ہے کہ عالمی زبان کا یہ خصوصی شمارہ وسیع تر اردو دنیا میں قابل قدر پذیرائی سے ہم کنار ہوگا۔مولانا ظفر علی خاں کے ایک نعتیہ شعر پر میں یہ تبصرہ مکمل کرتا ہوں:

گر ارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیاروں میں

☆☆☆

Urdu Zaban ki Ahmiyat by Dr. Afroz Jahan (Prof. Dept. of Urdu, Govt. Geetanjali College, Bhopal) cell-9303074141

ڈاکٹر افروز جہاں (پروفیسر، شعبہء اردو، گورنمنٹ گیتانجلی کالج بھوپال)

اُردو زبان کی اہمیت

اردو جو ہندوستان کی مقبول ترین زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ اردو کی مِٹھاس شیرینی ہر انسان کے دل کو چھوٗ لیتی ہے۔ جس زبان کو ہم اردو کے نام سے جانتے ہیں۔ اس زبان کو کافی عرصۂ دراز کے بعد اردو نام ملا۔ اس سے پہلے اس زبان کو ہندی، ہندوی، دکنی کہا گیا۔ بہر حال اس کی نشوونما میں کثرت سے ہندی کے الفاظ شامل رہے۔ اردو مغلیہ حکومت میں پروان چڑھی جب یہاں سرکاری زبان فارسی تھی۔ اس میں فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں رسم الخط بھی فارسی ہے۔ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ ہندوستان کی زبان ہے شاہجہاں کے دور میں اردو زبان اس قدر امیر و کبیر ہوگئی تھی کہ اسے اردوئے معلیٰ کا نام دیا گیا۔ اردو ۱۸ ویں صدی تک ہر خاص و عام ہندو مسلمان کی زبان بن گئی تھی۔ یہ زبان مسلسل پھل پھول رہی تھی کہ ۱۸ ویں صدی کے آخر میں فرنگی تاجروں کے گروہ نے مغلیہ حکومت کو زوال پر لا کر کھڑا کر دیا۔ ملک کے بیشتر حصّوں میں برطانیہ حکومت قائم ہوگئی۔ فورٹ ولیم کالج فرنگی حکومت نے اپنی ضرورتوں کے لیے قائم کیا۔ جہاں انگریز حکومت نے ہر زبان کے ترجمہ ہندوستانی زبان اردو میں کرایا۔ اگر چہ یہ انگریزوں کی ضرورت تھی مگر یہ اردو زبان کی صلاحیت کو اُجاگر کر گیا۔

رام بابو سکسینہ نے کہا ہے کہ انگریزوں کا یہ فیصلہ اردو زبان کے حق میں اچھا فیصلہ تھا۔ فورٹ ولیم کالج کی بدولت اردو کی نثری اصناف میں اضافہ ہوا۔ آزادی سے

پہلے اردو ملک کی جن بڑی زبانوں میں تھی ان میں انگریزی ہندی گجراتی مراٹھی بھی شامل تھی۔ انگریزی زبان کی اہمیت سرکاری سطح پر تھی عوام اور کاروبار مجلسی حلقوں میں اردو کو ہی مقبولیت حاصل تھی۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد اردو کی مقبلیت پر اثر پڑا۔ بعض ریاستوں کے سبب ۸/علاقائی زبانوں کے سبب اردو ایک فاصلے کی چیز ہو کر رہ گئی اردو کو آزادی کے بعد سرکار کی بے رخی کا سامنا کرنا پڑا۔ اردو یوں تو ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی لیکن اس زبان کو سرکاری زبان کا درجہ صرف جموں کشمیر میں دیا گیا مرکزی حکومت کی طرف سے کئی اچھے قدم اُٹھائے گئے ۱۹۸۲ء میں سماجی فلاح کے لیے مرکزی وزارت کی طرف سے ایک اعلیٰ کمیٹی قائم کی جس میں وزارت وزیر جناب اندر کمار گجرال کو سونپی گئی اس میں اردو اَکادمیوں اور اردو یونیورسٹیوں کا قیام، ٹیلی ویژن پہ اردو کی خبریں دینے والی انجمنیں قائم کی گئیں۔

۱۹۸۸ء میں اردو زبان کی ترقی کے لیے اردو یونیورسٹی ڈاکٹر امبیڈکر یونیورسٹی اور نیشنل کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ساتھ باقاعدہ اشتراک وتعاون کا معاہدہ ہوا۔ مولانا آزاد یونیورسٹی اردو کے مشہور مرکز حیدر آباد میں قائم کیا گیا۔ اس لیے یونیورسٹی کا مقصد اردو کے لیے علمی پروگراموں اور طلباء کو زمانے کے نئے مسائل سے آگاہ کرنا تھا۔ اردو زبان ترقی کی راہ پر چل پڑی اور اب ۸۰/لیبوریٹری میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اردو کے شعبہ قائم ہو چکے ہیں۔

حال ہی میں دہلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ ملک کی پندرہ ریاستوں میں اردو اکادمیاں قائم کی جا چکی ہیں ملک میں مادری زبان کی حیثیت سے اردو کو چار کروڑ سے زیادہ لوگ بولتے ہیں ملک کے قانون میں شامل ۱۸/زبانوں میں اردو چھٹے نمبر پر ہے۔ اردو ایک طاقتور زبان ہے۔ اردو مفلس نہیں ہے اس کی نشوونما میں کئی جنم دیکھے ہیں ہر جنم میں اپنی پوری قوت وجوش کے ساتھ کھڑی رہی ہندوستان کی ہر دل عزیز زبان میں شمار ہے۔ ہندوسان کی گنگا جمنی تہذیب اردو کے ساتھ چمکی ہے۔

کتابیات:

(۱) رام بابو سکسینہ۔ تاریخ ادب اردو
(۲) مدھیہ پردیش میں اردو ادب کے پچیس سال
(۳) تاریخ ہندوسان۔

☆☆☆

Dr. Mohd. Mohsin : Urdu Afsane ka ek Motabar Naam by Dr. Asgar Ali
(Samastipur) cell-9801581683

ڈاکٹر اصغر علی (سمستی پور)

ڈاکٹر محمد محسن: اردو افسانے کا ایک معتبر نام

ڈاکٹر محمد محسن بین الاقوامی شہرت کے ماہر نفسیات تھے۔ انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ قارئین کو شعور، لاشعور، وراثت اور ماحول کے ناگزیر اثرات سے آگاہ کیا۔ ان کا نام نفسیاتی افسانہ نگاری کے حوالے سے ایک منفرد اور معتبر مقام رکھتا ہے۔ ڈاکٹر محمد محسن نے اڈنبرا یونیورسٹی انگلینڈ سے نفسیات میں پی ایچ ۔ ڈی کیا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ نفسیات مقرر ہوئے اور ۱۹۷۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے لیکن یو جی سی پروفیسر کی حیثیت سے مزید پانچ سال شعبہ سے جڑے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں اونچے اونچے نفس بخش عہدوں کے لیے آفر ملے لیکن انہوں نے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ ڈاکٹر محمد محسن کے افسانے صرف کہانی بیان نہیں کرتے بلکہ انسانی ذہن کی گہرائیوں میں اتر کر لاشعور اور تحت الشعور کی تہوں میں پہنچتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں مبالغہ آرائی کے بجائے سائنسی حقیقت نگاری ملتی ہے۔ چونکہ وہ خود نفسیات کے ماہر تھے اس لئے ان کے کردار جیتے جاگتے اور فطری لگتے ہیں۔ وہ کرداروں کے خارجی عمل سے زیادہ ان کی داخلی کیفیات پر توجہ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد محسن کی وابستگی ملک کے بہت سے علمی، ادبی، ثقافتی اور ملی اداروں سے بھی رہی۔ بہت سے اعزازات و انعامات سے بھی نوازے گئے۔ ان کی ادبی زندگی ناقابل فراموش رہی ہیں۔ ڈاکٹر محمد محسن کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ جو جولائی ۱۹۳۷ میں ''انوکھی مسکراہٹ'' کے نام سے ماہنامہ ''ساقی'' دہلی میں

چھپا تھا، ادبی دنیا میں بے حد مقبول ہوا۔ انہوں نے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۴ء تک یعنی صرف آٹھ سال افسانہ نگاری کی اور ان آٹھ سالوں میں صرف تیس افسانے لکھے جو ماہنامہ ''ساقی'' دہلی، ''معاصر'' پٹنہ اور ماہنامہ ''سہیل'' گیا میں شائع ہوئے۔ ان کا صرف ایک افسانوی مجموعہ ''انوکھی مسکراہٹ'' ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۱۴ افسانے ہیں۔ ان کا افسانہ ''انوکھی مسکراہٹ'' مختلف درجات کے نصاب میں شامل رہا ہے۔ یہ افسانہ اپنے طرز کا انوکھا نفسیاتی افسانہ ہے۔ اردو کے کئی افسانہ نگاروں نے اس طرز پر افسانے لکھنے کی کوشش کی لیکن کوئی اس مقام کو حاصل نہیں کر سکا۔ ڈاکٹر محمد محسن نے اپنے بیشتر افسانوں میں ورثہ اور ماحول کے ناگزیر اثرات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانوں کے کردار شعور سے زیادہ لاشعور کی گہرائی میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر قیام نیر اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر محمد محسن کے افسانوں میں انسانی نفسیاتی کیفیات کی عکاسی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ چونکہ وہ ایک ماہر نفسیات انسان ہیں اس لیے ان کے افسانوں میں نفسیاتی رنگ پایا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔''

(بہار میں اردو افسانہ نگاری۔ ڈاکٹر قیام نیر۔ آزاد پریس، پٹنہ۔ ۱۹۹۵ء، ص: ۲۴۲)

افسانے کے علاوہ ڈاکٹر محمد محسن کے دو تنقیدی مضامین کے مجموعے ''نفسیاتی زاویئے'' (۱۹۸۰) اور ''جائزے'' (۱۹۸۷ء) ''سعادت حسن منٹو، اپنی تخلیقات کی روشنی میں'' (منٹو کی حیات اور فن پر مبنی)، ''زخم کے پھول'' شعری مجموعہ (۱۹۸۸) اور خودنوشت سوانح حیات ''لمحوں کا کارواں'' (۲۰۰۲) شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمد محسن نے انگریزی زبان میں بہت سے نفسیاتی مضامین لکھے ہیں۔ انگریزی میں لکھی ہوئی ان کی کئی کتابیں ملک و بیرون ملک کے اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر محسن عظیم آبادی نے اردو میں کئی کتابیں لکھی ہیں لیکن انہیں زیادہ مقبولیت افسانے ہی کہ وجہ سے ملی۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے کرداروں میں فرائیڈ کے

نظریات کی آئینہ سامانی شعور طور پر کی ہے۔ چونکہ وہ فرائیڈ کے نظریات سے متاثر رہے ہیں اس لئے انہوں نے اپنے افسانوں میں نفسیاتی گرہیں کھولنے کی کوششیں کی ہیں۔ ان کا صرف ایک افسانوی مجموعہ ''انوکھی مسکراہٹ'' شائع ہوا۔ اس میں صرف ۱۴/افسانے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ رسائل وغیرہ میں شائع ہونے والے افسانوں کی تعداد ۱۸ ہے۔ یعنی انہوں نے کل ۳۰/افسانے لکھے۔ اتنے کم افسانے لکھنے کے باوجود افسانہ نگاری کے باب میں انہوں نے اپنا نام سنہرے حرفوں میں لکھوالیا ہے۔ کم افسانے لکھنے کے باوجود انہوں نے افسانوی ادب میں ایک اہم مقام حاصل کرلیا ہے۔ اتنے کم افسانے لکھنے کے باوجود انہیں اتنی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے افسانوں میں کتنی خوبیاں ہیں۔ ان کے افسانوں کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے فطرت انسانی کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے انسانی شخصیت کی تعمیر کے دوگونہ نفسیاتی عناصر ورثہ اور ماحول کے ناگزیر اثر کو دکھایا ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار شعور سے زیادہ لاشعور کی گہرائیوں میں سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس لیے ان سے انسانی شخصیت کی گہرائی کا جلوہ نمودار ہوتا ہے:

''آپ اگر اپنے روزمرہ کے کردار کا صحیح جائزہ لیں تو بیشتر حالات میں آپ یہ محسوس کریں گے کہ آپ کا ارادہ کچھ اور ہے اور آپ کا عمل کچھ اور۔ یہی نہیں بلکہ بسا اوقات آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ آپ کے عمل و کردار کی کوئی غرض و غایت نہیں گو آپ انہیں بروئے کار لانے پر مجبور ہیں۔ انسانی قوت ارادی کا استحکام آپ کو بالکل متزلزل معلوم ہوگا اور اس کی آزادی قطعاً بے معنی۔'' (تعمیر جنوں)

ڈاکٹر محمد محسن نے زیادہ تر افسانے انسانی نفسیات پر مبنی ہی لکھے ہیں لیکن ان کے کچھ افسانے ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ ''مزدور کا بیٹا'' ان کا ایسا ہی افسانہ ہے جو ادبی حلقوں میں خاصا مقبول بھی ہو چکا ہے۔ دراصل ترقی پسند تحریک نے پورے اردو ادب کو متاثر کیا تھا۔ اس تحریک نے بہت سے شعلہ بیان اور شعلہ قلم

فنکاروں کو پیدا کیا۔ بڑے بڑے ادیب وشاعر اس تحریک سے متاثر ہوکر شاہراہ ادب پر تیزی سے دوڑنے لگے۔ روایت سے بغاوت ہونے لگی۔ ادب کو ایک مخصوص نظریئے سے دیکھا جانے لگا۔ بھوک، پیاس، مزدوروں اور کسانوں کا استحصال، طبقاتی کشمکش وغیرہ کے علاوہ بہت طرح کی اصطلاحیں ادب میں جگہ پانے لگیں۔ ایسے ہیں ڈاکٹر محمد محسن جیسے نفسیاتی افسانہ لکھنے والے افسانہ نگار بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ وقت اور حالات کے مطابق ان کے کئی افسانوں میں ان حالات کی ہلکی پھلکی جھلک نظر آنے لگی۔ پروفیسر کمال الدین کے مطابق:

''ان حالات کی صرف ہلکی سی جھلک ان کے بعض افسانوں میں نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں میں پریم چند کا دیہات گاتا مسکراتا، روتا بسورتا نظر آتا ہے نہ سدرشن بالی، اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور سہیل عظیم آبادی کا پیارا نیارا اور انوکھا گاؤں اور نہ اس کے باشندے ہیں۔ ان کے افسانوں میں نہ نیاز فتحپوری کی تخلیقیت وتصوریت ہے نہ سجاد حیدر کا معصوم رومان، ان کے افسانوں میں ترقی پسندی کا فیشن آیا ہے نہ اختر اورینوی کی رومان بھری حقیقت نگاری ہی ملتی ہے۔ انہوں نے سب سے ہٹ کر اپنے افسانوں کی بنیاد انسان کے نفسیاتی عوامل ومحرکات پر رکھی ہے۔''

(تنقید کی زبان۔ ڈاکٹر ایم کمال الدین۔ آزاد پریس، پٹنہ، ۲۰۰۰ء، ص:۸۹)

ڈاکٹر محمد محسن کے افسانوں کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے تحلیل نفسی پر مبنی افسانے لکھے اور ایسے کردار وضع کئے جن کی نفسیات کسی نہ کسی واقعے یا حالات سے متاثر رہی۔ انہوں نے بچپن میں ذہن پر پڑنے والے انمٹ واقعات پر مبنی افسانے لکھے۔ بچپن کا دور انسانی نفسیات کی تشکیل کا زمانہ ہوتا ہے۔ بچپن میں اگر کسی حادثے کا اثر ذہن پر پڑ جاتا ہے تو وہ زندگی بھر قائم رہتا ہے۔ ماحول کے اثرات غیر محسوس طریقے سے انسان کی شخصیت میں جذب ہوجاتے ہیں، بعد میں چل کر انسان اضطراری طور پر وہ کام کرنے کو مجبور ہوجاتا ہے جس کو وہ نہیں بھی کرنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر سید محمد محسن کے افسانوں کے پلاٹ کی بنیاد انسانی نفسیات پر مبنی ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار ذہنی کوائف کی عکاسی کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی ان کے افسانے دلکش ہیں۔ ان کا اسلوب بیان سادہ اور رواں ہے۔ اگر کہیں جدت کی کمی دکھائی دیتی ہے تو کہیں تازگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ''انوکھی مسکراہٹ''، ''تعمیر جنوں''، ''ردعمل''، ''نئی ماما''، ''مزدور کا بیٹا''، ''خون کا اثر''، ''احساس گناہ'' اور ''جھوٹی بھوک'' وغیرہ ڈاکٹر محمد محسن کے بہت ہی اچھے افسانے ہیں۔ اب تک ان کے فن پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اپنے افسانوں کی بدولت وہ اردو ادب میں ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے کیونکہ ان کے افسانوں کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔

اس طرح مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کی دنیا میں ڈاکٹر محمد محسن کا نام ادب و احترام سے لیا جاتا رہے گا۔

☆☆☆

Parvez Shahidi ki Nazm "Taslees-e-Hayat" : Ek Jaeza by Isa Aslam'

(Saharsa) cell-9060689481

عیسیٰ اسلم (سہرسہ)

پرویز شاہدی کی نظم 'تثلیث حیات': ایک جائزہ

اردو ادب کی تاریخ میں ترقی پسند تحریک نے جہاں اجتماعی شعور کو نئی جلا بخشی، وہاں چند ایسے منفرد شعرا بھی پیدا کیے جنہوں نے سیاسی نظریات کو محض نعرہ نہیں بننے دیا بلکہ انہیں فن کی لطافت اور ذاتی مشاہدے کی آنچ دے کر آفاقی سچائیوں میں بدل دیا۔ ان معتبر ناموں میں پرویز شاہدی کا مقام نہایت منفرد اور اہم ہے۔ سید اکرام حسین، جو ادبی دنیا میں پرویز شاہدی کے نام سے معروف ہوئے، 1910ء میں پٹنہ کی اس علمی و ادبی سرزمین پر پیدا ہوئے جہاں ان کا خاندان مسندِ ارشاد پر متمکن تھا۔ تاہم، پرویز نے خاندانی پیری مریدی کے بجائے ایک ایسے فکری راستے کا انتخاب کیا جس کی بنیاد انسانیت کی خدمت اور سماجی تبدیلی پر تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم اگرچہ روایتی اور مذہبی تھی، جس میں انہوں نے درسِ نظامیہ مکمل کیا، مگر ان کے اندر کا متلاشی ذہن انہیں انگریزی تعلیم اور جدید عصری علوم کی طرف لے گیا۔ کلکتہ ہجرت اور وہاں جبلی انسٹی ٹیوٹ سے میٹرک کے بعد پٹنہ سے گریجویشن، قانون کی ڈگری اور پھر اردو و فارسی میں ایم اے تک کا سفر ان کی علمی پختگی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ کلکتہ میں قیام کے دوران مظفر احمد اور سبھاش مکھرجی جیسے اشتراکی رہنماؤں سے ان کی ملاقات نے ان کے فکر و عمل کا رخ ہمیشہ کے لیے مارکسی نظریات کی طرف موڑ دیا۔ وہ محض ایک نظریاتی مارکسی نہیں تھے بلکہ کمیونسٹ پارٹی کے ایک فعال ستون کے طور پر ابھرے، جس کی پاداش میں انہیں نظر بندی اور قید

و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ مالی مشکلات اور ملازمت کے چھن جانے کے باوجود ان کے پایہ استقلال میں لغزش نہ آئی اور یہی وہ دور تھا جب ان کے اندر کا فنکار اپنی پوری توانائی کے ساتھ بیدار ہوا۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں

موقع یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا شرط جینے کی لگا دی مجھے مرنے نہ دیا
اس رفاقت پہ فدا میری پریشاں حالی اپنی زلفوں کو کبھی تو نے سنورنے نہ دیا
تیری غمخوار نگاہوں کے تصدق کہ مجھے غم ہستی کی بلندی سے اترنے نہ دیا

یوسف امام کا کہنا ہے کہ 'بیدل، شاد اور یگانہ کے بعد بہار سے ابھرنے والے باکمال اور قادر الکلام شعرا میں تین نام سرِ فہرست ہیں: جمیل مظہری، پرویز شاہدی اور اجتبیٰ رضوی'..... 'جمیل مظہری اور پرویز شاہدی کا عروج تیس سے زیادہ برسوں پر محیط رہا اور یہ دونوں اپنی زندگی میں مشرقی ہندوستان میں لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر گئے'۔ اردو یا فارسی ادب کا کوئی بھی طالبِ علم اگر بیدل، شاد اور یگانہ سے ناواقف ہے تو شاید اس کا شمار بے علموں میں ہوگا اور اگر کسی کو صرف فارسی ادب کا شناسا ہونے کا دعویٰ ہے تو اس پر بھی یہ حد جاری ہوتی ہے کہ وہ بیدل کو جانتا ہو۔ لیکن اردو ادب کے حوالے سے اس طرح کی حد کا اطلاق جمیل مظہری، پرویز شاہدی اور اجتبیٰ رضوی کے حوالے سے نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی باتیں کرنا ان تینوں کے ساتھ ہی نہیں اردو ادب کے ساتھ بھی زیادتی ہوگا۔ اس حوالے سے مظہر امام کا ہے کا کہنا ہے 'پرویز شاہدی کی اصل شہرت اور مقبولیت بہار اور بنگال میں تھی۔۔۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جو عزت، محبت، شہرت اور مقبولیت انہیں بنگال میں ملی وہ شاید وحشت کلکتوی کے علاوہ اردو کے کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی'۔

اردو ادب کی تاریخ میں ترقی پسند تحریک نے جہاں اجتماعی شعور اور طبقاتی جدوجہد کو زبان دی، وہاں چند ایسے منفرد شعرا بھی پیدا کیے جنہوں نے سیاسی نظریات کو محض نعرہ نہیں بننے دیا بلکہ انہیں فن کی لطافت اور ذاتی مشاہدے کی آنچ دے کر آفاقی بنا دیا۔ ان شعرا میں پرویز شاہدی کا نام ایک ایسے قدآور تخلیق کار کے طور پر ابھرتا ہے جن

کے ہاں جوش ملیح آبادی کی گھن گرج اور فیض احمد فیض کی کلاسیکی غنائیت کا ایک نہایت متوازن اور دلکش امتزاج ملتا ہے۔ پرویز شاہدی کی شاعری محض سیاسی احتجاج کا بیان نہیں بلکہ یہ انسانی وجود کے اس ارتقائی سفر کی داستان ہے جو ماضی کے تجربات سے سبق لیتی ہے، حال کی تپش میں خود کو کندن بناتی ہے اور مستقبل کے ایک روشن خواب کی تعبیر ڈھونڈتی ہے۔ ان کی فکری پختگی اور فنی مہارت کا عروج ہمیں ان کی معرکتہ الآرا نظم 'تثلیث حیات' میں نظر آتا ہے، جو نہ صرف ان کے شعری مجموعے کا عنوان ہے بلکہ جدید اردو نظم کے ارتقا میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم کی تخلیق کا محرک ایک نہایت لطیف اور جذباتی واقعہ ہے، یعنی ان کی بیٹی کی پیدائش۔ عام طور پر ذاتی نوعیت کے واقعات پر لکھی گئی نظمیں انفرادی خوشی یا غم تک محدود رہ جاتی ہیں، لیکن پرویز شاہدی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بیٹی کی آمد کو کائنات کے اس عظیم تسلسل سے جوڑ دیا جسے وہ 'تثلیث'، یعنی تین اکائیوں کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ یہاں تثلیث سے مراد زندگی کے وہ تین ابعاد ہیں جو ماضی، حال اور مستقبل کی صورت میں انسانی تاریخ کو ترتیب دیتے ہیں۔ باپ کی حیثیت سے وہ اپنی بیٹی کے معصوم چہرے میں صرف اپنا عکس نہیں دیکھتے بلکہ انہیں اس میں وہ پوری انسانیت نظر آتی ہے جو صدیوں کے جبر کو سہتی ہوئی اب ایک نئی سحر کی دہلیز پر کھڑی ہے۔

یہ نظم دراصل ایک ایسی فکری تکون تشکیل دیتی ہے جس کے ایک کونے پر انسانی تاریخ کی وراثت ہے، دوسرے پر موجودہ عہد کی کشمکش اور تیسرے پر وہ روشن امکانات جن کی نوید نئی نسل کی صورت میں نمودار ہوئی ہے۔ پرویز شاہدی نے اس نظم میں مارکسی فلسفے کو بڑی خوبصورتی سے پرویا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی ساکن نہیں بلکہ ایک متحرک عمل ہے، اور ہر نئی زندگی پچھلی نسلوں کی جدوجہد کا تسلسل ہوتی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے اسے بتاتے ہیں کہ وہ کس طرح کے کٹھن راستوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہے۔ نظم کا اسلوب جاہ و جلال سے بھرپور ہے لیکن اس میں ایک باپ کی ممتا جیسی

نرمی بھی شامل ہے۔ وہ اسے زندگی کے ان تضادات سے اگاہ کرتے ہیں جو طبقاتی سماج کی دین ہیں، مگر ان کا لہجہ یاسیت کا شکار نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے ایک مجاہد کی طرح زندگی کے میدان میں اترنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پرویز شاہدی کی نظم اپنی انفرادی حیثیت سے نکل کر اجتماعی شعور کا حصہ بن جاتی ہے۔ ان کا تصورِ حیات جدوجہد سے عبارت ہے، وہ موت کو فنا نہیں سمجھتے بلکہ اسے زندگی کے اگلے مرحلے کی تمہید قرار دیتے ہیں۔ فنی اعتبار سے 'تثلیثِ حیات' پرویز شاہدی کے لسانی رچاو کا شاہکار ہے۔ انہوں نے جس طرح کی تراکیب اور استعاروں کا استعمال کیا ہے، وہ ان کی کلاسیکی تربیت اور جدید شعور کے ملاپ کا نتیجہ ہیں۔ نظم کے آہنگ میں ایک ایسی لہر موجود ہے جو قاری کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں انتہائی محتاط ہیں اور ہر لفظ کو ایک خاص مقصد کے تحت استعمال کرتے ہیں۔ جہاں وہ ماضی کے اندھیروں کا ذکر کرتے ہیں وہاں ان کے الفاظ میں ایک طرح کی بوجھل کیفیت محسوس ہوتی ہے، اور جہاں وہ مستقبل کی بات کرتے ہیں وہاں ان کا اسلوب روشن اور توانا ہو جاتا ہے۔ یہ نظم اردو کی ان چند نظموں میں سے ہے جو فلسفیانہ گہرائی رکھنے کے باوجود انسانی جذبات سے اپنا رشتہ ٹوٹنے نہیں دیتیں۔ نظم ''تثلیث حیات'' کے ابتدائی چند بند ملاحظہ ہوں:۔

انگلیاں میری ہیں لب میرے ہیں آنکھیں میری
میری پیشانی کا ٹکڑا تری پیشانی ہے
ننھی ننھی یہ بھنوئیں تیری ہیں یا میری ہیں
تیری رگ رگ میں مرے خون کی جولانی ہے

دست و پا میں جو یہ کیفیت سیمابی ہے میری ہی روح کی نکھری ہوئی بیتابی ہے
اپنے شعروں میں جڑے روح کے ٹکڑے کتنے اپنے افکار کو خوں دل کا پلا کر پالا

مجموعہ تثلیث حیات کے پیش لفظ میں خود پرویز شاہدی اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

'میری شاعری اچھی ہو یا بری، کلاسیکی اسالیبِ فکر و اظہار سے گراں بار ہو یا غیر مستحسن بدعتوں سے بوجھل، قارئینِ کرام کو میرے اشعار میں جگ بیتی یا آپ بیتی کی کوئی نہ کوئی جھلک ضرور نظر آ سکتی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ بھی میرا فریبِ نفس ہو لیکن میری حسرتِ خود شناسی اور تمنائے تعارف کے لیے کوئی قابلِ اعتبار سہارا ابھی تو نہیں'۔

پرویز شاہدی کی شاعری کو فنی اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؛ ایک وہ حصہ جہاں وہ گہری اشتراکیت کے علمبردار نظر آتے ہیں اور دوسرا وہ جہاں ان کی فکری رومانیت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کے مجموعہ کلام ''رقصِ حیات'' اور ''تثلیثِ حیات'' اس ارتقائی سفر کے گواہ ہیں۔ ان کی شہرت اور مقبولیت کا مرکز اگرچہ بنگال اور بہار کا علاقہ رہا، جہاں انہیں وحشت کلکتوی کے بعد سب سے زیادہ عزت و محبت ملی، مگر ان کے فن کی جڑیں اردو ادب کی آفاقی روایات میں پیوست ہیں۔ ان کی شاعری میں جوش ملیح آبادی کی خطابت اور فیض احمد فیض جیسی کلاسیکی غنائیت کا ایک انوکھا امتزاج ملتا ہے۔ ان کی شاہکار نظم ''تثلیثِ حیات'' ان کے شعری سفر کا وہ نقطۂ عروج ہے جہاں ذاتی جذبہ اور کائناتی فلسفہ ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ یہ نظم انہوں نے اپنی پہلی بیٹی ثمینہ کی پیدائش کے موقع پر لکھی تھی۔ ایک باپ کے لیے بیٹی کی آمد محض ایک خوشی کا موقع نہیں تھی بلکہ پرویز شاہدی نے اس معصوم وجود میں زندگی کے اس عظیم تسلسل کو دیکھا جسے وہ "تثلیث" یعنی ماضی، حال اور مستقبل کا سنگم قرار دیتے ہیں۔ نظم کا آغاز نہایت گہرے جذباتی اور جسمانی تعلق کے اظہار سے ہوتا ہے جہاں شاعر اپنی بیٹی کی پیشانی، آنکھوں اور بھنوں میں اپنا عکس دیکھتا ہے۔

'انگلیاں میری ہیں لب میرے ہیں آنکھیں میری
میری پیشانی کا ٹکڑا تری پیشانی ہے

جیسے مصرعے اس فطری وابستگی کو بیان کرتے ہیں جو ایک نسل کا دوسری نسل سے ہوتا ہے۔ مگر یہاں پرویز شاہدی صرف ایک باپ نہیں رہتے بلکہ وہ ایک فلسفی بن

جاتے ہیں جو اپنی بیٹی کی رگوں میں دوڑنے والے خون کو اپنے افکار کی جولانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ بچی ان کے ان خوابوں کی تعبیر ہے جنہیں انہوں نے اپنے خونِ دل سے پالا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کے سیمابی دست و پا میں اپنی ہی روح کی بیتابی دیکھتے ہیں، مگر اس ذاتی مشاہدے کو وہ فوراً ہی ایک وسیع تر انسانی تناظر دے دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ نئی زندگی اس ماضی کا حاصل ہے جو جبر و استحصال کے اندھیروں میں گزرا اور اس مستقبل کی نوید ہے جہاں صبحِ گلشن رقص فرما ہے۔ نظم میں وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ ابھی پوری طرح سے شامِ صحرا کی نقاب نہیں الٹی، یعنی وہ جس سماجی انقلاب اور روشن مستقبل کے خواب دیکھ رہے ہیں، وہ ابھی پردے میں ہے مگر اس کی آہٹیں سنائی دے رہی ہیں۔

پرویز شاہدی کی اس نظم میں تفکر کی ایک گہری چھاپ نظر آتی ہے جو انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ جہاں علی سردار جعفری کی شاعری خارجی احساسات اور سیاسی پیغام رسانی تک محدود ہو جاتی ہے، وہاں پرویز شاہدی کے ہاں ایک داخلی گہرائی اور گیرائی ملتی ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ انہوں نے اپنے افکار کو محض نظریاتی بوجھ نہیں بنایا بلکہ انہیں شعری لطافت کے ساتھ پیش کیا۔ ان کی غزلوں میں بھی وہی انفرادیت ملتی ہے جہاں وہ غمِ ہستی کی بلندی سے نہ اترنے کا عزم ظاہر کرتے ہیں اور یاس کے اندھیروں میں بھی جینے کی شرط لگا دیتے ہیں۔ ان کا یہ لب ولہجہ ان کی زندگی کے عملی تجربات کا نچوڑ ہے۔ وہ ایک ایسے شاعر تھے جو اپنے کلام کی تشہیر سے لاتعلق رہے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کی اہمیت بڑھتی گئی۔ یہ ایک المیہ ہے کہ اردو کے کئی بڑے محققین اور تاریخ نگاروں نے ان کے فن کی طرف سے چشم پوشی کی، حالانکہ خلیل الرحمن اعظمی جیسے نقادوں نے ان کے امتیازات کی نشاندہی کی تھی۔

'تثلیثِ حیات' صرف ایک نظم یا ایک شعری انتخاب نہیں بلکہ یہ ایک ایسے عزم کا اظہار ہے جو انسانیت کی بقا اور اس کے ارتقا پر یقین رکھتا ہے۔ پرویز شاہدی نے اس

نظم کے ذریعے یہ پیغام دیا کہ فرد مر سکتا ہے مگر زندگی کا تسلسل کبھی نہیں ٹوٹتا۔ وہ اپنی بیٹی کو مخاطب کر کے دراصل آنے والی ہر نسل کو یہ بتا رہے ہیں کہ ان کی رگوں میں دوڑنے والا خون ان تمام مجاہدوں اور مفکروں کی امانت ہے جنہوں نے ایک بہتر دنیا کا خواب دیکھا۔ ان کے پیش لفظ میں موجود انکساری کہ ''میری شاعری اچھی ہو یا بری، کلاسیکی اسالیب سے گراں بار ہو یا غیر مستحسن بدعتوں سے بوجھل' ان کے بلند اخلاق اور مخلصانہ فن کا ثبوت ہے۔ وہ ایک ایسے پُر یقین اور پُر عزم انسان تھے جن کا طرزِ زندگی ہی ان کی اصل شاعری تھا۔ اگرچہ بعض ناقدین نے انہیں اپنے حلقے کی حد سے زیادہ تعریفوں کا 'مقتول' قرار دیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے فن میں وہ جوہر موجود ہے جو اسے کسی بھی سرحد یا نظریے کے حصار سے آزاد کر کے اردو ادب کے ماتھے کا جھومر بنا دیتا ہے۔ پرویز شاہدی کی ''تثلیثِ حیات' اردو نظم کے اس روشن مستقبل کی علامت ہے جہاں فن اور نظریہ ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ حلیف بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان کا نام اور کام ہمیشہ ان کے اشعار کی طرح زندہ رہے گا کیونکہ انہوں نے اپنی روح کے ٹکڑوں کو شعروں میں جڑ کر انہیں جاویدانی عطا کر دی ہے۔

☆☆☆

Chat GPT aur Urdu Zaban Ka Iktesab by Yusuf Shakil (Research Scholar MANUU CTE, Darbhanga) cell-8171193150

یوسف شکیل (ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، سی ٹی ای، دربھنگہ)

چَیٹ جی پی ٹی اور اردو زبان کا اکتساب

تلخیص: اردو کا شمار دنیا کی ایک عظیم زبان کے طور پر ہوتا ہے۔ worlddata.info کے مطابق اردو کو مادری و ثانوی زبان کے طور پر 90 ملین افراد استعمال کرتے ہیں۔ برِّصغیر خصوصاً ہند و پاک میں اِس زبان کے بولنے والے افراد بکثرت موجود ہیں۔ یہ مدارس، اسکول اور جامعات، ہر سطح پر پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے، اس کے اکتساب اور درس و تدریس میں جدید ٹکنالوجی کی شمولیت روز افزوں ہے، مصنوعی ذہانت اور نئے نئے ماڈلز اپنے وجود کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ یہ تحقیقی مقالہ ''چَیٹ جی پی ٹی اور اردو زبان کا اکتساب'' کے موضوع کا اِحاطہ کرتا ہے، جس میں تعلیمی میدان میں جدید ٹکنالوجی کے مثبت اثرات، درس و تدریس میں پیش آمدہ چیلنجز اور اس کے مؤثر استعمال کے امکانات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

چَیٹ جی پی ٹی کو اردو زبان کے معلم و متعلم کے لیے ایک مؤثر اور جدید معاون ذریعے کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے، جو جملوں کی ساخت، اظہار کے نِت نئے طریقوں، قواعد اور مختلف الفاظ و معانی کی تفہیم میں مددگار ہوگا۔ یہ زبان کے اکتساب میں طلبا و طالبات کی رفتار کا خیال رکھ سکتا ہے، نیز اس کے ذریعے فوری فیڈ بیک اور وضاحت و تشریح جیسے فوائد کا حصول ممکن ہے۔ تاہم اردو زبان کے محاورے، مختلف قِسم اور پسِ منظر رکھنے والے اصطلاحات کی کماحقہٗ فہم جیسے چیلنجز بھی اس کو درپیش ہوں

گے۔اس کے ساتھ ساتھ معلم اور طلبا و طالبات کا چَیٹ جی پی ٹی یا مصنوعی ذہانت پر حد درجہ اعتماد و انحصار اکتسابی عمل پر برے اثرات مرتب کر سکتا ہے۔

اس تحقیقی مقالے میں مختلف چیلنجز اور امکانات کا جائزہ لیا گیا ہے نیز تعلیمی اداروں کے لیے سفارشات پیش کی گئی ہیں جس کی روشنی میں وہ اردو زبان کے اکتساب و تدریس میں چَیٹ جی پی ٹی کا زیادہ سے زیادہ مؤثر اور مفید استعمال کا عملی منصوبہ تیار کر سکیں گے۔تحقیق کے نتائج اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اگر اس جدید ٹیکنالوجی کو تدریسی اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے توازن کے ساتھ استعمال میں لایا جائے تو اردو زبان کی آموزش میں اس کی حیثیت ایک سنگِ میل کی ہوگی۔

کلیدی الفاظ: اردو تدریس، مصنوعی ذہانت، چَیٹ جی پی ٹی، زبان کا اکتساب، تعلیمی ٹکنالوجی، جدید تدریسی طریقے۔

تمہید۔ اردو دنیا کی اہم اور زندہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ برصغیر کی تہذیبی روایت، ادبی سرمائے اور فکری تنوع نے اسے ایک منفرد شناخت عطا کی ہے۔مختلف عالمی لسانیاتی اعداد و شمار کے مطابق اردو کو کروڑوں افراد مادری یا ثانوی زبان کے طور پر استعمال کرتے ہیں، جس سے اس کی وسعت اور اثر پذیری کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو نہ صرف ایک رابطے کی زبان ہے؛ بلکہ یہ ایک مکمل تہذیبی و ثقافتی نظام کی نمائندہ بھی ہے، جس کے دامن میں شاعری، نثر، تنقید، مذہبی و فکری مباحث اور علمی روایت کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے۔اسی بنا پر اردو زبان کی تدریس محض لسانی عمل نہیں؛ بلکہ تہذیبی و فکری تربیت کا بھی ذریعہ ہے۔

عصری دور میں تعلیم اور درس و تدریس کے میدان میں جدید ٹیکنالوجی نے غیر معمولی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ ڈیجیٹل ذرائع، آن لائن پلیٹ فارمز اور خودکار نظاموں نے تعلیمی عمل کو روایتی حدود سے نکال کر ایک نئے مرحلے میں داخل کر دیا ہے۔خصوصاً مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) نے تدریسی حکمتِ عملیوں، مواد کی

تیاری اور سیکھنے کے طریقوں کو نئی جہت عطا کی ہے۔ ماہرین تعلیم کے نزدیک مصنوعی ذہانت ایسے نظاموں پر مشتمل ہے جو انسانی ذہانت سے وابستہ بعض افعال، مثلاً فہم، تجزیہ اور زبان کے استعمال کو مشینی سطح پر انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں (Luckin et al., 2016)۔ اسی تناظر میں زبان کی تدریس میں بھی AI پر مبنی ماڈلز کی افادیت پر سنجیدہ بحث شروع ہو چکی ہے (Holmes et al., 2019)۔

حالیہ برسوں میں مصنوعی ذہانت پر مبنی لسانی ماڈلز، خصوصاً چَیٹ جی پی ٹی، نے تعلیمی حلقوں میں خاص توجہ حاصل کی ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جو زبان کی ساخت، اسلوب اور مفہوم کو سمجھتے ہوئے سوالات کے جوابات فراہم کرنے، وضاحت و خلاصہ تیار کرنے اور تخلیقی تحریر میں معاونت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک اس نوع کے ماڈلز زبان آموزی میں معاون اور سہولت کار ثابت ہو سکتے ہیں، تاہم ان کے استعمال سے وابستہ فکری، اخلاقی اور تدریسی مسائل بھی زیرِ بحث ہیں (Kasneci et al., 2023)۔ اردو زبان کے اکتساب کے تناظر میں چَیٹ جی پی ٹی کا کردار ایک اہم تحقیقی موضوع بن چکا ہے۔ کیا یہ ماڈل لغت، قواعد، تحریری اظہار اور تفہیمِ ادب میں مؤثر معاون ثابت ہو سکتا ہے؟ کیا اس کے ذریعے طلبا و طالبات کی انفرادی ضروریات کو بہتر طور پر پورا کیا جا سکتا ہے؟ یا اس پر غیر متوازن انحصار تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کو متاثر کر سکتا ہے؟ یہی وہ سوالات ہیں جو اس مقالے کی بنیاد تشکیل دیتے ہیں۔

اس تحقیقی مقالے کا بنیادی مقصد اردو زبان کے اکتساب میں چَیٹ جی پی ٹی کے کردار کا جائزہ لینا ہے۔ اس کے تحت تعلیمی میدان میں اس کی افادیت، تدریسی چیلنجز، ممکنہ خطرات اور مفید و مؤثر استعمال کے امکانات کا تجزیہ کیا جائے گا۔ مزید برآں، مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو متوازن انداز میں سامنے لاتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ اردو تدریس کے نظام میں اس مشینی ماڈل کو کس حد تک اور کن اصولوں کے تحت شامل کیا جا سکتا ہے۔

نظریاتی پس منظر: مصنوعی ذہانت اور زبان کی تدریس۔ مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) عصرِ حاضر کی اُن نمایاں سائنسی پیش رفتوں میں سے ہے جنہوں نے انسانی زندگی کے تقریباً ہر شعبے کو متاثر کیا ہے۔ تعلیم کا میدان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ مصنوعی ذہانت سے مراد ایسے خودکار اور مشینی نظام ہیں جو ڈیٹا کے تجزیے، پیٹرن کی شناخت، زبان کی تفہیم اور مسئلہ حل کرنے جیسے افعال کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تعلیمی سیاق میں یہ نظام سیکھنے کے عمل کو انفرادی بنانے، فوری فیڈ بیک فراہم کرنے اور تدریسی مواد کو طلبا و طالبات کی ضرورت کے مطابق ترتیب دینے میں معاون سمجھے جاتے ہیں (Luckin et al., 2016)۔

زبان کی تدریس میں مصنوعی ذہانت کا استعمال نسبتاً زیادہ توجہ کا مرکز بنا ہے؛ کیوں کہ زبان سیکھنا ایک تدریجی، تعاملی امر ہے۔ روایتی طور پر زبان کی آموزش میں استاذ مرکزی حیثیت رکھتا ہے، جو قواعد، لغت، اسلوب اور تلفظ کی درستی میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ تاہم ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے اس عمل میں معاون وسائل کا اضافہ کر دیا ہے۔ خودکار ترجمہ، صوتی شناخت (speech recognition)، اور تحریری تصحیح کے نظام زبان سیکھنے والوں کے لیے سہولت پیدا کرتے ہیں۔ بعض تحقیقات کے مطابق AI پر مبنی ٹولز طلبا و طالبات کو فوری تصحیح، مشق کے متنوع مواقع اور انفرادی رفتار کے مطابق رہنمائی فراہم کر سکتے ہیں، جو زبان سیکھنے کے عمل کو مؤثر بناتا ہے (Holmes et al., 2019)۔ لسانی ماڈلز، خصوصاً وہ جو بڑے پیمانے پر متنی مواد پر تربیت یافتہ ہوتے ہیں، زبان کی ساخت، معنی اور اسلوبیاتی پہلوؤں کو سمجھنے اور پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چَیٹ جی پی ٹی جیسے ماڈلز اسی نوعیت کے نظام کی مثال ہیں، جو سوال و جواب، وضاحت، خلاصہ نویسی اور تخلیقی تحریر میں معاونت فراہم کرتے ہیں۔ حالیہ مطالعات میں اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ ایسے ماڈلز تعلیمی معاون کے طور پر استعمال کیے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ ان کے استعمال کو واضح تعلیمی اصولوں اور اخلاقی رہنما خطوط کے تحت منظم کیا جائے

(Kasneci et al., 2023)۔

اردو زبان کی تدریس کے تناظر میں مصنوعی ذہانت کا تصور نسبتاً نیا ہے، اگرچہ جدید ٹیکنالوجی کا استعمال اس سے قبل بھی مختلف صورتوں میں موجود رہا ہے۔ اردو کی تدریس میں آڈیو ویژول وسائل، ڈیجیٹل لغات اور آن لائن تعلیمی پلیٹ فارمز سے استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کے کردار پر بعض محققین نے یہ واضح کیا ہے کہ ڈیجیٹل ذرائع زبان کی تفہیم، دلچسپی اور رسائی میں اضافہ کرتے ہیں (احمد، 2018)۔ تاہم مصنوعی ذہانت پر مبنی خودکار لسانی ماڈلز اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر تعاملی اور انفرادی نوعیت کی معاونت فراہم کرتے ہیں۔ اس نظریاتی پس منظر سے واضح ہوتا ہے کہ مصنوعی ذہانت محض ایک تکنیکی سہولت نہیں؛ بلکہ ایک تدریسی چیلنج اور موقع دونوں ہے۔ زبان کے اکتساب میں اس کا کردار اس بات پر منحصر ہے کہ اسے کس حد تک استاذ کی رہنمائی، نصابی اہداف اور تعلیمی اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جاتا ہے؛ چناں چہ اردو زبان کی تدریس میں چَیٹ جی پی ٹی جیسے ماڈلز کا جائزہ لیتے وقت ہمیں نہ صرف اس کی تکنیکی صلاحیتوں؛ بلکہ اس کے تعلیمی، اخلاقی اور لسانی مضمرات کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔

چَیٹ جی پی ٹی کے عملی پہلو۔ اردو زبان کا اکتساب ایک ہمہ جہت عمل ہے جس میں لغت، قواعد، تحریری اظہار، فہمِ ادب اور بول چال کی مہارت سب شامل ہوتے ہیں۔ چَیٹ جی پی ٹی جیسے لسانی ماڈلز ان مختلف پہلوؤں میں بطور معاون وسیلہ کیا ستعمال کیے جا سکتے ہیں۔ یہ نظام سوال و جواب کی بنیاد پر فوری رہنمائی فراہم کرتا ہے، جس سے سیکھنے والے کو انتظار اور رسمی حدود سے آزادی ملتی ہے؛ تاہم اس کی افادیت کا درست اندازہ اسی وقت ممکن ہے جب اسے تدریسی مقاصد کے تحت منظم انداز میں برتا جائے (Kasneci et al., 2023)۔

لغت اور قواعد کے میدان میں چَیٹ جی پی ٹی نمایاں سہولت فراہم کر سکتا ہے۔ کسی لفظ کے معنی، مترادفات، متضادات اور جملے میں استعمال کی وضاحت فوری طور پر

حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح نحوی وصرفی قواعد سے متعلق سوالات کے جواب اور مثالیں فراہم کی جا سکتی ہیں۔ زبان سیکھنے کے ابتدائی اور متوسط مراحل میں فوری تصحیح اور مثالوں کی فراہمی سیکھنے کے عمل کو تقویت دیتی ہے، جیسا کہ تعلیمی تحقیق میں فوری فیڈ بیک کو مؤثر تدریسی عنصر قرار دیا گیا ہے(Holmes et al., 2019)۔ اردو زبان کے قواعد، مثلاً تذکیر وتانیث، جمع کی ساخت یا مرکب الفاظ کے استعمال میں طلبا و طالبات کو جو مشکلات پیش آتی ہیں، ان کے حل میں یہ ماڈل ایک مشق گاہ کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ تحریری اور تخلیقی اظہار کے فروغ میں بھی چَیٹ جی پی ٹی معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ طلبا و طالبات کسی موضوع پر مضمون نویسی، مکالمہ نگاری یا کہانی نویسی کی مشق کرتے ہوئے اس سے رہنمائی لے سکتے ہیں۔ جملوں کی ساخت، اسلوب کی بہتری اور عبارت کی روانی کے سلسلے میں تجاویز حاصل کی جا سکتی ہیں۔ تاہم یہاں یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ رہنمائی اور مکمل انحصار میں فرق ہے؛ اگر طلبا و طالبات تیار شدہ متن کو بلا تنقید قبول کریں تو ان کی تخلیقی صلاحیت متاثر ہوسکتی ہے(Luckin et al., 2016)۔ اس لیے اس کا کردار مشیر اور معاون کا ہونا چاہیے، مصنف یا محقق کا نہیں۔ ادب اور شاعری کی تفہیم میں بھی یہ ماڈل ابتدائی رہنمائی فراہم کر سکتا ہے۔ کسی نظم یا نثری اقتباس کا عمومی مفہوم، مرکزی خیال یا مشکل الفاظ کی وضاحت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح تشریح اور خلاصہ نگاری کی مشق میں طلبا و طالبات مختلف نمونے دیکھ کر اپنی تحریر بہتر بنا سکتے ہیں۔ تاہم ادبی متون کی تہہ دار معنویت، علامتی پہلو اور ثقافتی پس منظر کی مکمل تفہیم استاذ کی رہنمائی ہی سے ممکن ہے۔ بول چال اور مواصلاتی مہارت کے فروغ میں بھی چَیٹ جی پی ٹی ایک عملی مشق کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ طلبا و طالبات روزمرہ گفتگو کے جملے، رسمی وغیر رسمی اندازِ بیان اور تلفظ سے متعلق رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اگرچہ اردو کے صوتی پہلو مکمل طور پر تحریری ماڈل سے واضح نہیں ہو سکتے، لیکن جملوں کی ساخت اور مناسب الفاظ کے انتخاب میں یہ معاونت فراہم کر سکتا ہے۔ ترجمہ اور لسانی معاونت کے میدان میں اس کی

افادیت نمایاں ہے۔طلبا و طالبات اردو سے دوسری زبانوں میں اور دیگر زبانوں سے اردو میں ترجمے کی مشق کر سکتے ہیں۔اس عمل کے ذریعے وہ الفاظ کے درست انتخاب، جملوں کی ترتیب اور مفہوم کی منتقلی کے اصول سمجھ سکتے ہیں۔ تاہم محاورات، ثقافتی اشاروں اور سیاقی معنویت کے مسائل میں محتاط رہنا ضروری ہے؛ کیوں کہ خودکار نظام بعض اوقات لفظی ترجمے تک محدود رہ جاتا ہے۔

مزید برآں، چَیٹ جی پی ٹی بطور ذاتی اتالیق بھی کردار ادا کر سکتا ہے۔روایتی کلاس روم میں ہر طالب علم کو انفرادی توجہ میسر نہیں ہوتی، جب کہ یہ ماڈل کسی بھی وقت سوالات کے جواب فراہم کر سکتا ہے۔ انفرادی رفتار کے مطابق وضاحت طلب کرنا، مثالیں دہرانا اور مخصوص مسئلے پر توجہ دینا اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔اس اعتبار سے یہ زبان سیکھنے والے کے لیے ایک ہمہ وقت دستیاب معاون وسیلہ بن سکتا ہے، بشرطیکہ اس کے استعمال میں تعلیمی توازن اور رہنمائی برقرار رکھی جائے۔

تعلیمی نظام میں چَیٹ جی پی ٹی کے امکانات۔موجودہ تعلیمی نظام تیزی سے ڈیجیٹل تبدیلی کے مرحلے سے گزر رہا ہے، جہاں روایتی تدریسی طریقوں کے ساتھ ساتھ ٹیکنالوجی پر مبنی وسائل کو بھی شامل کیا جا رہا ہے۔ اس تناظر میں چَیٹ جی پی ٹی جیسے مصنوعی ذہانت پر مبنی ماڈلز نئے امکانات کو جنم دیتے ہیں۔ یہ امکانات صرف تدریسی سہولت تک محدود نہیں؛ بلکہ سیکھنے کے پورے عمل کی تنظیمِ نو سے متعلق ہیں۔ ماہرین تعلیم کے نزدیک AI ایسے نظام فراہم کرتا ہے جو سیکھنے کے عمل کو شخصی (personalized) بنا سکتے ہیں، یعنی ہر طالب علم کی رفتار اور ضرورت کے مطابق مواد پیش کیا جا سکتا ہے (Luckin et al., 2016)۔

اردو زبان کی تدریس میں یہ انفرادی نوعیت کی سہولت خاص اہمیت رکھتی ہے؛ کیوں کہ زبان سیکھنے والے طلبا و طالبات کی استعداد، لسانی پس منظر اور فہم کی سطح مختلف ہوتی ہے۔چَیٹ جی پی ٹی کے ذریعے طالب علم کسی بھی وقت اپنی مشکل کے مطابق سوال

کرسکتا ہے اور فوری وضاحت حاصل کرسکتا ہے۔ اس طرح سیکھنے کا عمل استاذ کی موجودگی کے مخصوص اوقات تک محدود نہیں رہتا؛ بلکہ ہمہ وقت جاری رہ سکتا ہے۔ یہ خصوصیت خاص طور پر آن لائن اور فاصلاتی تعلیم کے نظام میں مؤثر ثابت ہوسکتی ہے (Holmes et al., 2019)۔ تعلیمی اداروں کے لیے بھی اس میں متعدد امکانات پوشیدہ ہیں۔ اساتذہ اس ماڈل کو اسائنمنٹ کی تیاری، مشقی سوالات کی تشکیل اور نصابی نکات کی وضاحت کے لیے بطور معاون وسیلہ کے استعمال کر سکتے ہیں۔ اگرچہ تدریسی عمل کی مکمل ذمہ داری کسی مشینی نظام کو سونپنا مناسب نہیں؛ تاہم اسے معاون ٹول کے طور پر شامل کرنا تدریسی بوجھ میں کمی اور وقت کے بہتر استعمال کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس طرح استاذ زیادہ توجہ تخلیقی اور تنقیدی سرگرمیوں پر مرکوز کرسکتا ہے۔ آن لائن تعلیم اور (blended) نظامِ تدریس میں بھی چیٹ جی پی ٹی کا کردار اہم ہوسکتا ہے۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر سیکھنے والے طلبا و طالبات کو فوری فیڈ بیک، وضاحت اور اضافی مواد فراہم کرنا اکثر ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ مصنوعی ذہانت پر مبنی ماڈلز اس خلا کو کسی حد تک پُر کر سکتے ہیں، جس سے تعلیمی مواد کی رسائی اور افادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اردو زبان کی تدریس میں، جہاں معیاری ڈیجیٹل مواد کی کمی کا مسئلہ بھی موجود ہے، یہ ماڈل طلبا و طالبات کو ابتدائی رہنمائی فراہم کرسکتا ہے۔

مزید برآں، تعلیمی ٹیکنالوجی کے فروغ میں بھی ایسے ماڈلز کا کردار قابلِ توجہ ہے۔ جدید تعلیمی رجحانات اس بات پر زور دیتے ہیں کہ طلبا و طالبات کو ڈیجیٹل مہارتوں سے آراستہ کیا جائے تاکہ وہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ رہ سکیں۔ چیٹ جی پی ٹی کا معتدل اور باقاعدہ استعمال طلبا و طالبات کو ٹیکنالوجی کے ذمہ دارانہ استعمال کی تربیت بھی دے سکتا ہے۔ تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ تعلیمی ادارے واضح رہنما اصول مرتب کریں؛ تاکہ یہ ٹیکنالوجی سہولت کار بنے، استاذ کا متبادل نہیں۔ یوں دیکھا جائے تو اردو زبان کے اکتساب میں چیٹ جی پی ٹی کے امکانات وسیع ہیں؛ لیکن ان کی کامیابی کا

انحصار اس بات پر ہے کہ اسے کس حد تک نصابی اہداف، تدریسی حکمتِ عملی اور اخلاقی اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جاتا ہے۔ اعتدال، نگرانی اور تعلیمی مقصدیت کے بغیر یہ امکانات مطلوبہ نتائج نہیں دے سکتے۔

چیلنجز اور تنقیدی مباحث۔ چَیٹ جی پی ٹی جیسے مصنوعی ذہانت پر مبنی ماڈلز جہاں متعدد تعلیمی امکانات رکھتے ہیں، وہیں ان کے استعمال سے متعلق کئی سنجیدہ چیلنجز بھی موجود ہیں۔ اردو زبان کے اکتساب کے تناظر میں یہ چیلنجز لسانی، ثقافتی، تدریسی اور فکری سطحوں پر سامنے آتے ہیں۔ اگر ان پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ نہ لیا جائے تو یہ ٹیکنالوجی سہولت کے بجائے مسئلہ بھی بن سکتی ہے۔ سب سے پہلے لسانی پیچیدگیوں کا مسئلہ قابلِ ذکر ہے۔ اردو زبان اپنے محاورات، استعارات، تشبیہات اور تہہ دار اسالیب کے سبب ایک گہری معنوی ساخت رکھتی ہے۔ محاورے مختلف علاقوں اور سماجی طبقات میں مختلف مفہوم اختیار کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''اونٹ کے منہ میں زیرہ'' جیسی کہاوت کا لفظی ترجمہ مفہوم کو واضح نہیں کرتا؛ بلکہ اس کے لیے ثقافتی اور سیاق کا فہم درکار ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض جملے طنزیہ یا دو معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، جیسے ''واہ بھائی کمال ہے''، جو موقع کے لحاظ سے تحسین یا تنقید دونوں معنی دے سکتا ہے۔ مشینی ماڈلز کے لیے ایسے متضاد یا سیاق کے استعمال میں امتیاز کرنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا۔ تحقیق سے بھی یہ واضح ہوا ہے کہ بڑے لسانی ماڈلز بعض اوقات سیاق و سباق کی باریکیوں کو مکمل طور پر نہیں سمجھ پاتے (Kasneci et al., 2023)۔ ثقافتی اور سماجی حساسیت ایک اور اہم چیلنج ہے۔ ہر زبان اپنے معاشرتی اور تہذیبی پس منظر سے جڑی ہوتی ہے۔ بعض موضوعات، جیسے سماجی اقدار، مذہبی معاملات یا صنفی کردار، مختلف معاشروں میں مختلف زاویوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اگر کوئی ماڈل عمومی یا مغربی تناظر میں تیار شدہ مواد کی بنیاد پر جواب دے تو مقامی ثقافتی حساسیت مجروح ہو سکتی ہے۔ اس لیے اردو زبان کی تدریس میں ایسے نظام کا استعمال کرتے وقت اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ طلبا و طالبات کو تنقیدی شعور بھی

فراہم کیا جائے، تاکہ وہ ہر جواب کو حتمی سچ نہ سمجھیں؛ بلکہ اس کا تجزیہ بھی کریں۔ ایک بڑا فکری مسئلہ معلم و متعلم کا مصنوعی ذہانت پر حد سے زیادہ انحصار ہے۔ اگر طلبا و طالبات تحقیق، مضمون نویسی یا تخلیقی سرگرمیوں میں مکمل طور پر چَیٹ جی پی ٹی پر انحصار کرنے لگیں تو ان کی خود سوچنے، استدلال کرنے اور تنقیدی تجزیہ کرنے کی صلاحیت متاثر ہو سکتی ہے۔ ماہرین تعلیم اس امر پر زور دیتے ہیں کہ AI کو معاون ٹول کے طور پر استعمال کیا جائے، نہ کہ انسانی ذہانت کے متبادل کے طور پر (Luckin et al., 2016)۔ اسی طرح اگر اساتذہ تدریسی تیاری اور مواد کی تشکیل میں مکمل انحصار کرنے لگیں تو تخلیقی تدریسی حکمتِ عملی کمزور پڑ سکتی ہے۔ نصاب میں مؤثر انضمام بھی ایک عملی چیلنج ہے۔ موجودہ نصابی ڈھانچہ عموماً روایتی ساخت پر مبنی ہوتا ہے، جب کہ مصنوعی ذہانت کے ماڈلز تیزی سے بدلتی ہوئی معلومات اور الگورتھمز پر کام کرتے ہیں۔ اس فرق کو پاٹنے کے لیے تعلیمی اداروں کو واضح پالیسی، اساتذہ کی تربیت اور مواد کی جانچ کے معیار وضع کرنے ہوں گے۔ مزید یہ کہ اس بات کا تعین بھی ضروری ہے کہ AI سے حاصل کردہ مواد کس حد تک مستند اور نصاب کے اہداف کے مطابق ہے (Holmes et al., 2019)۔

ان تمام تنقیدی مباحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اردو زبان کے اکتساب میں چَیٹ جی پی ٹی کا استعمال محض تکنیکی معاملہ نہیں؛ بلکہ ایک فکری و تدریسی ذمہ داری بھی ہے۔ اگر اسے غیر محتاط انداز میں اپنایا جائے تو لسانی باریکیوں، ثقافتی حساسیت اور تخلیقی صلاحیت پر منفی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس، اگر اسے رہنمائی، اعتدال اور تنقیدی شعور کے ساتھ شامل کیا جائے تو یہ ایک مؤثر معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

عملی مشاہدہ و تجزیہ۔ اس تحقیقی مطالعے کے ضمن میں محدود پیمانے پر چند طلبا و طالبات اور اساتذہ سے تبادلۂ خیال کیا گیا؛ تاکہ اردو زبان کے اکتساب میں چَیٹ جی پی ٹی کے عملی استعمال سے متعلق براہِ راست آرا حاصل کی جا سکیں۔ اس غیر رسمی مشاہدے کا مقصد کسی حتمی شماریاتی نتیجے تک پہنچنا نہیں تھا؛ بلکہ تدریسی فضا میں اس ٹیکنالوجی کے اثرات کو سمجھنا

تھا۔ تعلیمی تحقیق میں اس نوع کے ابتدائی مشاہدات کو آئندہ منظم مطالعات کے لیے بنیاد قرار دیا جاتا ہے(Holmes et al., 2019)۔

طلبا و طالبات کی اکثریت نے اس امر کا اظہار کیا کہ چَیٹ جی پی ٹی اردو زبان کے اکتساب میں ایک معاون اور سہولت کار وسیلہ ثابت ہو سکتا ہے۔ خصوصاً لغت اور قواعد کی درستی، جملہ سازی کی مشق اور مشکل متون کے ابتدائی فہم میں انہیں اس سے فائدہ محسوس ہوا۔ بعض طلبا و طالبات نے یہ بھی بتایا کہ فوری جواب مل جانے سے ان کی ہچکچاہٹ کم ہوئی اور وہ بار بار سوال کرنے میں زیادہ اعتماد محسوس کرتے ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو یہ ماڈل انفرادی سیکھنے کے ماحول کو تقویت دیتا ہے، جیسا کہ شخصی تعلیم (personalized learning) کے تصور میں بیان کیا جاتا ہے(Luckin et al., 2016)۔ تاہم اساتذہ کی آرا میں احتیاط اور تشویش کا عنصر نمایاں تھا۔ چند اساتذہ نے خدشہ ظاہر کیا کہ اگر طلبا و طالبات تحقیق یا تحریری کام میں مکمل طور پر اس ماڈل پر انحصار کرنے لگیں تو ان کی تخلیقی و تنقیدی صلاحیت متاثر ہو سکتی ہے۔ ان کے مطابق زبان کا حقیقی اکتساب محض معلومات کے حصول کا نام نہیں؛ بلکہ فہم، تجزیہ اور اظہار کی ذاتی مشق کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لیے اگر چَیٹ جی پی ٹی کو بغیر نگرانی اور رہنمائی کے استعمال کیا جائے تو یہ سہولت کے ساتھ ساتھ سستیِ فکر کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ مشاہدے سے ایک اور پہلو سامنے آیا کہ طلبا و طالبات اس ٹیکنالوجی سے بھرپور استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؛ لیکن انہیں اس کے ذمہ دارانہ استعمال کی تربیت دینا ناگزیر ہے۔ اگر انہیں یہ باور کرایا دیا جائے کہ چَیٹ جی پی ٹی ایک مشیر اور معاون ہے، حتمی اتھارٹی نہیں، تو وہ اس سے بہتر انداز میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے تعلیمی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ واضح رہنما اصول وضع کریں اور طلبا و طالبات کے اندر تنقیدی انداز میں مواد کا جائزہ لینے کی عادت ڈالیں۔ یوں عملی مشاہدے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ چَیٹ جی پی ٹی اردو زبان کے اکتساب میں مفید کردار ادا کر سکتا ہے؛ لیکن اس کی

افادیت کا انحصار اعتدال، نگرانی اور تدریسی حکمتِ عملی پر ہے۔

نتائج۔اس تحقیقی جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ چَیٹ جی پی ٹی اردو زبان کے اکتساب میں ایک مؤثر معاون وسیلہ بن سکتا ہے، خصوصاً ابتدائی اور متوسط درجے کے طلبا و طالبات کے لیے۔لغت، قواعد، جملہ سازی اور ابتدائی تفہیمِ متن کے مرحلے میں فوری رہنمائی اور مثالوں کی فراہمی سیکھنے کے عمل کو سہل اور تیز بنا سکتی ہے۔تعلیمی تحقیق بھی اس امر کی تائید کرتی ہے کہ مصنوعی ذہانت پر مبنی نظام فوری فیڈ بیک اور شخصی طور پر سیکھنے کے ماحول کو فروغ دیتے ہیں (Luckin et al., 2016)۔یہ بھی واضح ہوا کہ چَیٹ جی پی ٹی کے ذریعے اردو زبان کے اکتساب کو زیادہ دلچسپ اور تعاملی بنایا جا سکتا ہے۔ طلبا و طالبات کو سوال و جواب کی سہولت، خلاصہ نگاری کی مشق اور ترجمے کی تربیت جیسے پہلوؤں میں مدد ملتی ہے۔تاہم اس پر مکمل انحصار روایتی تدریسی طریقوں کے اُن مثبت پہلوؤں کو متاثر کر سکتا ہے جو تخلیقی اور تنقیدی فکر کی نشوونما کے لیے ضروری ہیں؛ اس لیے اسے بنیادی متبادل کے بجائے معاون ٹول کے طور پر شامل کرنا زیادہ مناسب ہوگا (Kasneci et al., 2023)۔مزید یہ کہ اردو زبان کی لسانی و ثقافتی پیچیدگیوں کے پیشِ نظر اس ماڈل کی حدود بھی سامنے آتی ہیں۔محاورات، تہذیبی سیاق اور سماجی حساسیت جیسے پہلوؤں میں انسانی فہم کی اہمیت برقرار رہتی ہے۔اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مصنوعی ذہانت تدریسی عمل کی تکمیل کر سکتی ہے؛ لیکن اس کی مکمل جگہ نہیں لے سکتی۔

سفارشات۔اردو زبان کی تدریس میں چَیٹ جی پی ٹی کی شمولیت کو ایک معاون وسیلے کے طور پر اختیار کیا جائے، نہ کہ مرکزی متبادل کے طور پر۔تعلیمی ادارے واضح پالیسی اور رہنما اصول مرتب کریں، جن کے تحت اس ٹیکنالوجی کا استعمال متعین حدود میں رہے اور طلبا و طالبات کو ذمہ دارانہ اور تنقیدی استعمال کی تربیت دی جائے۔اساتذہ کو بھی مصنوعی ذہانت کے تعلیمی امکانات اور حدود سے آگاہ کرنا ضروری ہے؛ تاکہ وہ اسے تدریسی

منصوبہ بندی میں مؤثر اور متوازن انداز میں شامل کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان، ادب اور قواعد کے ماہرین اور ٹیکنالوجی کے ماہرین کے مابین اشتراک کو فروغ دیا جائے؛ تاکہ ایسے لسانی ماڈلز کو اردو کے مزاج اور ساخت کے مطابق بہتر بنایا جا سکے۔ آخر میں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ چَیٹ جی پی ٹی ایک سہولت کار ہے، حتمی استاذ نہیں۔ اگر اسے تدریسی اصولوں، نصابی اہداف اور اخلاقی حدود کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے تو یہ اردو زبان کی آموزش میں ایک مثبت اور انقلابی کردار ادا کر سکتا ہے۔

اختتامیہ۔ اردو زبان کا اکتساب ایک ہمہ گیر اور تہذیبی عمل ہے جو محض قواعد و لغت کی تعلیم تک محدود نہیں؛ بلکہ فکری تربیت، تنقیدی شعور اور تخلیقی اظہار کی نشوونما سے بھی وابستہ ہے۔ عصرِ حاضر میں مصنوعی ذہانت، خصوصاً چَیٹ جی پی ٹی جیسے لسانی ماڈلز نے تدریسی منظرنامے میں ایک نئی بحث کو جنم دیا ہے۔ اس مقالے میں اس امر کا جائزہ لیا گیا کہ یہ مشینی نظام اردو زبان کی تدریس میں کس حد تک معاون ثابت ہو سکتا ہے اور اس کے استعمال سے وابستہ امکانات اور چیلنجز کیا ہیں؟ تحقیقی و تجزیاتی مباحث سے یہ واضح ہوا کہ چَیٹ جی پی ٹی لغت، قواعد، خلاصہ نگاری، ترجمہ اور ابتدائی فہمِ ادب جیسے پہلوؤں میں مؤثر معاونت فراہم کر سکتا ہے۔ انفرادی سیکھنے کی رفتار، فوری فیڈ بیک اور ہمہ وقت دستیابی اسے ایک کارآمد تعلیمی وسیلہ بناتی ہے۔ تاہم اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ اردو زبان کی تہہ دار معنویت، ثقافتی حساسیت اور محاوراتی پیچیدگیوں کو مکمل طور پر مشینی سطح پر سمجھنا آسان نہیں۔ مزید برآں، اگر اس ٹیکنالوجی پر غیر متوازن انحصار کیا جائے تو طلبا و طالبات اور اساتذہ کی تخلیقی و تنقیدی صلاحیت متاثر ہو سکتی ہے۔

چناں چہ اس تحقیق کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ چَیٹ جی پی ٹی اردو زبان کیا کتساب میں ایک مؤثر اور مفید ذریعہ بن سکتا ہے، بشرطیکہ اسے اعتدال، نگرانی اور تدریسی اصولوں کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ یہ روایتی تدریسی عمل کا متبادل نہیں؛ بلکہ اس کی تکمیل کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ مستقبل میں منظم تجرباتی تحقیق، نصابی ہم آہنگی اور اساتذہ کی تربیت کے ذریعے

اس کے تعلیمی استعمال کو مزید مؤثر بنایا جا سکتا ہے؛ تاکہ اردو زبان کی تدریس کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ رکھتے ہوئے اس کی فکری و تہذیبی روح کو بھی محفوظ رکھا جا سکے۔

حوالہ جات:

Holmes, W., Bialik, M., &Fadel, C. (2019). Artificial intelligence in education : Promises and implications for teaching and learning. Center for Curriculum Redesign.

Kasneci, E., Sessler, K., Küchemann, S., Bannert, M., Dementieva, D., Fischer, F., …Kasneci, G. (2023). ChatGPT for good? On opportunities and challenges of large language models for education. Learning and Individual Differences, 103, 102274.

Luckin, R., Holmes, W., Griffiths, M., &Forcier, L. B. (2016). Intelligence unleashed: An argument for AI in education. Pearson Education.

احمد، وحید۔ (2018)۔ اردو زبان کی تدریس میں جدید ٹیکنالوجی کا کردار۔ الفیصل پبلشرز۔

☆☆☆

Bansi Nirdosh aur Kashmiri Novel by Raees Ahmad (Research Scholar dept. of Kashmiri, University of Kashmir, Srinagar) cell-9149715275
رئیس احمد (ریسرچ اسکالر، شعبۂ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر)

بنسی نردوش اور کشمیری ناول

کشمیری زبان و ادب میں ناول نگاری کا شغل خاصہ پُرانہ بھی نہیں رہا ہے۔ حالانکہ اس بات سے بھی گریز نہیں کہ کشمیری زبان میں ناول نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب تک کے ناول سرمایے کا جایزہ لیا جاے تو قاری کو مایوسی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ کشمیری زبان میں ناول کا فقدان کے جواب میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن وہ اس مضمون کے لیے باعث طوالت ہوگا۔ الغرض اس قلیل سرمایے میں بھی کچھ نمونے اس بات کا ثبوت ہے کہ کشمیری زبان میں ناول تخلیق کرنے کی وہی سکت موجود ہے جو باقی زبانوں میں ہے۔ لکھے گیے ناول کشمیر کی تمدنی، ثقافتی، تہذیبی اور سیاسی غرض زندگی کے ہر شعبے کی رہنمایی کرتی نظر آرہی ہے۔ کچھ ناول تہذیب کا خاصا معیار حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہے ہے جن کو پڑھ کر اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ یہ ناول صرف تفریحی چیز نہیں بلکہ تہذیبی مطالعہ اور زہنی ورزش بھی ہے۔ اس نویت کے ناولوں کی تعداد اگرچہ بہت کم ہے پھر بھی یہ کشمیری نثری صنف کے بنیادی پتھر کہے جا سکتے ہے۔

کشمیری زبان میں ناول کا آغاز شری کنٹھ توشخانی نے ''لیلا'' لکھ کر 1922 میں کیا تھا۔ اس ناول کا موضوع عورتوں کے بنیادی حقوق اور تعلیم کے متعلق تھا۔ حالانکہ یہ ناول مکمل چھاپ نہیں ہو پایا ہے لیکن اس کی کچھ قسطیں بہار گلشن کشمیر اخبار میں چھپ چُکی تھیں۔ اس اخبار میں ایک کشمیری سیکشن بھی تھا جس کے ایڈیٹر توشخانی صاحب خود رہ چُکے تھے۔ اسی طرح کی نامکمل اور ناقص کوشش حبیب کامران نے بھی کی تھی جب انہوں نے ''زات

تبراتے‘‘ لکھی تھی اس ناول کے بھی کچھ حصیر سالہ کونگ پوش 1955 ، میں چھپ چکے تھے۔اس کے بعد کشمیری زبان کی پہلی اور مکمل ناول’’ دود تہ دگ‘‘ منظر عام پر آتی ہے۔ مشہور افسانہ نگار شری اختر محی الدین کی لکھی اس ناول کے بعد بہت سے اشخاص اس صنف کی آبیاری کی طرف گامزن ہوتے گے۔ بعد کے آنے والے ناول نگاروں میں امین کامل کی’’ گٹہ من زگاش، علی محمد لون کی’’ س تہِ چھِ انسان‘‘، غلام نبی گوہر کی’’ مجرم‘‘’’ میل‘‘’’شین تہ وتہِ پوذ‘‘اور بنسی نردوش کی ناول’’ اکھ دور‘‘ قابل غور ہے۔

ان میں سے بعض ناولوں کا موضوع عشق اور محبت رہا ہے۔مجموعی طور پر دیکھا جاے تو کشمیری ناولوں کا غالب موضوع عشق ہی رہا ہے۔ان تمام کاوشوں کی نتیجہ یہ ہے کہ کشمیری ناول اپنے ابتدایی مراحل کو کامیابی کے ساتھ مکمل کرتی آ رہی ہے۔ ان تصانیف سے ایک کشمیری ادب میں گہرایی آتی جارہی ہے اور دوسرا توازن بھی کسی حد تک برقرار ہورہا ہے۔ غلام نبی گوہر کے یہاں عشق و عاشقی کے علاوہ تمدنی وراثت کی پاسداری بھی ملتی ہے۔ وہ ایک طرف کشمیر کے قدرتی مناظر کے شیدایی پاے جاتے ہے تو دوسری طرف فلسفیانہ خیالات کے ضامن بھی۔اسی طرح علی محمد لون بھی سیکولر سوچ کے ساتھ مذہب، رنگ اور نسل کے تفرق کو خیر باد کہہ کر انسانی اقدار کی پیش کش کرتے ہے۔اختر محی الدین بھی انسانی وجود میں پیوست جنسیات کو مرد اور عورت کے فطری میلانات کا نتیجہ، کے طور پر پیش کرتے ہے۔

بنسی نردوش کشمیری ادب میں بحیثیتِ افسانہ نگار ہر آنکھ کا تارا ہے۔ ناول نگاری میں ان کا نام’’ اکھ دور‘‘ ناول کی وجہ سے لیا جاے گا۔اگر چہ یہ ایک چھوٹی سی ناول ہے اس کے برعکس بھی یہ ناول نگاری کے تمام لوازمات کو پورا کرتا ہے۔ 1974 میں منظر عام پر آنے والا ناول کا ظاہری موضوع نگینہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات پر مبنی ہے۔ ناول نگار نگینہ کی زندگی کو پیش کر کے در پردہ اپنے تجربات کا مظاہرہ کر رہے ہے۔ اگر چہ اس ناول کو کشمیر پر ڈوگرہ حکمرانوں کا جاگیردارانہ نظام کی عکاسی کرنے والا

فن پارہ سمجھا جا تا ہے لیکن ناول نگار کہی پر بھی ناول میں اُس دور کے سیاسی نظام اور بادشاہوں کا ذکر نہیں کرتے ہے۔اس بات کی تصدیق صرف اس بات سے کی جاسکتی ہے کہ یہ ناول اسی زمانے کا سیاسی نہیں بلکہ سماجی پہلو اُجاگر کرتا ہے۔اس بات پر بھی کوئی شُبہ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ ناول ڈوگرہ حکومت کے دوران کشمیری سماج کو پیش کرنے کی عمدہ مثال ہے۔بنسی نردوش کی کوشش یہ بھی رہی ہے کہ وہ کشمیر کی قدیم ترین پرمپرا ہندو مسلم اتحاد اور سیکولرازم کی پاسبانی کرے۔

نگینہ جو کہ ایک غریب کسان دین محمد نامی شخص کی بیٹی ہے، اپنے باپ کی مزاج پُرسی کے لیے گاوں سے شہر آتی ہے۔ہسپتال میں ملاقات کے بعد گھر کی طرف نکلنے کے برعکس ایک اور بار اپنے والد کی دید کو ترسنے والی نگینہ رات کو ٹھہر کر اگلی صبح باپ سے دبارہ مل کر جانے کا مشورہ کرتی ہے۔رات کو کہی ٹھہرنے کی سہولیت نہ ہونے کی وجہ سے پاس میں موجود آستاں میں رُکنے کا ارادہ کرتی ہے۔اس آستاں کو جہاں نگینہ اللہ کا گھر سمجھ کر ٹھہرتی ہے وہی اسی جگہ پر ان کی ملاقات ایک دلال اور عصمت فروشسے ہوتی ہے۔ بہلا پھسلا کر نگینہ کو جسم فروشی کے اڈے پر لیا جاتا ہے جہاں ایک ہندو، بلبد رنامی شخص اس کی ناز وادا اور کم عمری دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔الغرض نگینہ، ماہ رُخ پری جیسی صورت سے بلبد رکو محبت ہو جاتی ہے۔فریفتگی کی حالت میں بلبد رنگینہ کی تین سو روپیہ ماہانہ قیمت طے کر کے نگینہ کا اکلوتا گاہک بن جاتا ہے۔اسی دوران ہسپتال سے باپ کے مرنے کی خبر نے نگینہ کی بچی کُچی آش پر بھی مہر لگا دی تھی۔بے سہارا ہو کر نگینہ بھی اب بلبد ر کو شریک حیات اور اس اڈے کو گھر تسلیم کر چُکی تھی۔آپسی تعلقات بڑھ جانے پر نگینہ اب ماں بننے والی ہوتی ہے جس پر اُس کو اعلاج ومعالجہ کے بہانے بلبد رسے الگ کیا جاتا ہے۔بلبد روارفتگی کی حالت میں کشمیر، پنجاب، لاہور اور دیگر جگہوں پر جا کر نگینہ کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔بالآخر اُسی ہسپتال میں پہنچ جاتا ہے جہاں نگینہ نے اک بیٹی کو جنم دیا تھا۔وہاں پر بلبد رنچی کو اپنا کر نگینہ کے ساتھ گھر کی طرف چل دیتے ہے۔اس ناول کا ہر

ایک واقعہ سماجی حقیقت پسندی کا آیینہ ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کی ایک بہترین مثال ہے پھر چاہے وہ غنی جو اور دھنہ وتی کا معاملہ ہو یا بلبد را ور نگینہ کا، ہر واقع آپسی یکجہتی اور اتحاد کا درس دیتی ہے۔

اکھ دور ناول کا پلاٹ بے حد مربوط ہے۔ اس ناول میں ہر واقع سلیقے اور ہنر مندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ واقعات کی ترتیب اور چست پلاٹ بنسی نردوش کی فنی بصیرت کا ضامن ہے۔ اگر چہ ناول کو پڑھ کر زیادہ زہنی ورزش نہ کرنی پڑتی ہو پر قاری جزباتی طور ناول کے ساتھ لگاو سا محسوس کرتا ہے۔ جزبہ نسوانی کو پیش کرنے کی طرف ناول نگار نے خاصی توجہ دی ہے۔ ناول کا پلاٹ پیچیدگیوں اور انتشار سے پاک رکھا گیا ہے۔ عام فہم اور سہل الاصوز بان کے ساتھ ساتھ واقعات میں فطری بہاو سے قاری کی دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے۔ اس دلچسپی کا انہاک اول سے آخر تک یکساں ہے۔ ناول میں پیش کردہ کردار اساسی حثیت رکھتے ہے۔ تمام کردار حقیقی اور دھرتی سے جُڑے عام انسان ہے۔ ہر اہم کردار زندگی کی تبدیلیوں سے متاثر ہے۔ خوبیوں اور خامیوں سے بھرے کردار ناول میں جان ڈال دیتے ہے۔ ناول میں کرداروں کے جزبات اور احساسات بھی عام انسانوں کی طرح ہے جس سے قاری ان کرداروں کو اپنے ماحول اور معاشرے کا فرد سمجھنے پر مجبور ہے۔ یہ قصہ ایک خاص طرز زندگی اور مخصوص زمانہ و ماحول کی مانگ کرتا ہے اس ضرورت کو مدنظر رکھ کر ناول نگار واقعی ایسا ماحول قایم کرنے میں کامیاب ہو چُکیہے۔ کشمیری سماجی اور جغرافیایی ماحول کے ساتھ ساتھ گاؤں اور شہری ماحول کی بھی عکاسی کی گیی ہے۔ جذبات نگاری میں بھی ناول نگار کی فنی پُختگی کا احساس ہوتا ہے۔ خواہ محبت کا جذبہ ہو یا کوئی المناک، فرحت آمیز ہو انشاط انگیز تمام اثرات کو مناسب طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ ان جذبات کو پیش کرنے میں زبان کا اہم رول رہا ہے۔ ناول نگار نے کسی بھی پیچیدہ بات کو سلیقے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

ان تمام اوصاف کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ بنسی نردوش کشمیری ناول کی دنیا میں

اپنا نام کما چکے ہے۔ ناول کی فنی اور تخلیقی اہمیت کو ایک طرف رکھ کر یہ بات بھی قابل داد ہے کہ یہ ناول کشمیری ناولوں کی ابتدائی کوششوں میں سے ایک ہے۔

کتابیات:

۱۔شاہ، انور۔ ہندو پاک میں اردو ناول: تقابلی مطالعہ، پیش رو پبلی کیشنز، دہلی

۲۔شوق، شفیع۔ ک شرِ ادبک تواریخ، علی محمد اینڈ سن زسرینگر کشمیر

۳۔ساقی، موتی لال۔ ناول کیاہ گیہ؟، ک شر ڈپارٹمنٹ، یونیورسٹی آف کشمیر، حضرتبل سرینگر

۴۔مضمر، مجید۔ کشمیری ڈراما اور فکشن، جے کے آفسیٹ پریس، دہلی

☆☆☆

Josh ke geeton mein Tasveeri Jamaliyat by Mohd. Taiyib (Dept. of centre for Urdu culture studies, MANUU, Hyderabad) cell-9567246590

محمد طیب جمشید پوری (ریسرچ اسکالر، مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت، مانو، حیدرآباد)

جوش کے گیتوں میں تصویری جمالیات

جوش کا شمار ہندو پاک میں ایک انقلابی شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ ان کی علمی، سماجی اور سیاسی خدمات ملک اور ادبی دنیا میں گراں قدر رہی ہیں۔ قوم کو بیدار کرنیاور بروقت اپنے کلام اور سحر بیانی سے صحیح رہنمائی کرنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ اندرا گاندھی اور مولانا ابوالکلام جیسے عبقری اور سیاسی شخصیات سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ تقسیم ہند کے واقعات اور حادثات کے وقت سیاسی اتار چڑھاؤ کے نتیجہ میں جو کشیدگی پیدا ہوئی تھی، اس وقت عوام میں بیداری، حوصلہ، استقامت، تحمل مزاجی اور بردباری کے ساتھ جس انداز سے جوش نے اپنے کلام سے عوام کو قابو میں کیا تھا وہ ان کا کمال فن تھا۔

وہ انقلابی مزاج کے ساتھ رومانوی مزاج، فطرت شناس اور ماحولیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ کارخانہ حیات کی چیزوں کو اپنے لفظوں میں جس خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتے ہیں اسے دیکھتے ہوئے دل و دماغ بے ساختہ انہیں شاعر مصور تسلیم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں آزادی، امن، مساوات، انسانی حقوق، فطرت کے دائرہ کار، اساطیر، تصوف، تنہائی، دیومالائی، بھوت، پریت اور انقلابی ماحول کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ان کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے 'پدم بھوشن' کے اعزاز سے 1954، میں اور پاکستان نے ہلال امتیاز سے نوازا گیا۔

نام: شبیر احمد خاں تھا اس کے بعد شبیر حسن خان۔ ولادت: 5 دسمبر 1896۔ ملیح

آباد (لکھنؤ) کے قریب قصبہ کنول ہار میں صبح سویرے چار بجے ہوئی۔ والد بشیر احمد خان۔ دادا محمد احمد خان۔ پردادا فقیر محمد خان تھے۔ جوش آفریدی خان سے تھے۔ یہ جاگیر دارانہ، اہل علم خاندان ہونے کے ساتھ بڑا ہی متشدد مزاج خاندان تھا۔ جوش خود اپنے خاندان کے مزاج کی سختی، مزاج میں ترفع اور انا کے مسئلے کے بارے یوں تحریر فرماتے ہیں:

''مدتوں تک ہمارا یہ عالم رہا کہ اگر کسی شادی بیاہ میں دو حریف گروہ آمنے سامنے کھٹوں پر بیٹھے حقہ پیتے تھے تو ان میں جب ایک گروہ کا آدمی کڑکڑ، کڑکڑ، کڑاک کی آواز نکال کر حقہ پیتا تھا تو دوسرے گروہ کے تمام آدمی اس کو اعلان جنگ سمجھ کر اس سے بھی کہیں زیادہ زور سے کڑکڑ، کڑکڑ، کڑکڑ، کڑاک کڑاک کڑاک کی آوازیں نکال کر اس قدر زور سے حقے پیتے تھے کہ چلموں سے آنچیں نکل آتی تھیں اور اس ضدّم ضدّا کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ پل بھر میں فریقین کے سر لہولہان ہو کر رہ جاتے تھے۔ لکھنؤ کے کمشنر یا گورنر نے ملیح آباد کے باب میں یہ جملہ نہایت ہی خوب لکھا تھا کہ ملیح آباد دورہ خیبر کا ایک ایسا جز ہے جس کا ہندوستان سے ابھی الحاق نہ ہو سکا''۔1

جوش اپنا تخلص شبیر سے جوش اختیار کیے۔ لفظ 'جوش' کی معنویت اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس تخلص اور اس کے انقلابی مزاج کا اندازہ کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کچھ اس طرح سے اظہار خیال کیا ہے:

''انھوں نے اپنا تخلص جوش بلاوجہ اختیار نہ کیا ہوگا۔ غالباً اپنی فطرت کے ہیجان انگیز عناصر کا انہیں شروع سے شدید احساس تھا۔ ان کے یہاں ابتدا ہی سے ایک زبردست قوت نمو، تخلیقی اُپج، پھٹ پڑنے اور بے اختیار بہالے جانے کی کیفیت ملتی ہے۔ وہ ایک بگولے کی طرح اٹھے اور طوفان بن کر چھا گیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اپنی تہلکہ خیزیوں سے ایوان شعر کے در و دیوار کو لرزا دیا۔ وہ سرتا سر ایک رومانی شاعر تھے اور شدید باغی۔''2

جوش کے انقلابی مزاج اور اپنے کلام کے ذریعہ انقلابی ماحول پیدا کرنے کی وجہ سے انہیں شاعر انقلاب کہا گیا۔ اس مفروضہ کی تائید میں پروفیسر نورالحسن نقوی کی یہ باتیں یہاں موزوں معلوم ہوتی ہیں:

''تحریک آزادی کی حمایت میں نظمیں کہیں تو انہیں ملک گیر شہرت حاصل ہوگئی اور انہیں شاعر انقلاب کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔''3؎

جنگلوں، ندیوں، جھرنوں، بہاروں، پہاڑوں، کلیوں، باغوں، درختوں، پیڑ پودوں، کھیت کھلیانوں، فصلوں، چاند ستاروں، بادلوں، پرندوں، چرندوں اور نباتات وغیرہ کے مناظر کو اپنے الفاظ کی جادوگری کو اپنی نظموں میں کچھ اس روانی اور خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس میں جان سی پڑ گئی ہے۔ نظموں میں فطرت کی عکاسی ملتی ہی ہے۔ لیکن ان کے گیتوں میں بھی یہ عناصر پائے جاتے ہیں۔ نظموں کے مقابلے میں گیت کم ہی ہے لیکن جتنے بھی ہیں وہ جوش کے مزاج شناسی، الفاظ وسحر بیانی کی ترجمانی کے لیے قابل قدر ہے۔ ان کی زبان دانی اور اس پر قدرت ہونے کی وجہ سے ادبی دنیا میں شاعر شباب، مصور شباب، شاعر رومان، الفاظ کے جادوگر، لفظوں کا بادشاہ، شاعر فطرت اور پیغمبر فطرت وغیرہ سے یاد کیے جاتے ہیں۔ الفاظ پر کمال کی قدرت، استعاروں اور تشبیہوں پہ بے انتہا دسترس ہونے کی وجہ سے انہیں الفاظ کا جادوگر بھی کہا گیا۔ فطرت شناسی، ماحول کی عکاسی اور قدرت کی خوبصورتی پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان باتوں کا کلام میں کثرت سے ذکر کرنے کی وجہ سے انہیں شاعر فطرت کہا گیا۔ جوش کی اس خوبی (مناظر فطرت) کو سراہتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی یوں رقمطراز ہیں:

''جوش نے مناظر فطرت پر جس کثرت سے نظمیں لکھی ہیں اس کی مثال پوری اردو شاعری میں نہیں ملے گی۔ صبح وشام، برسات کی بہار، گھٹا، بدلی کا چاند، ساون کا مہینہ، گنگا کا گھاٹ، یہ تمام مناظر جوش کی نظموں میں رقصاں وجولاں ہیں۔ بدلی کا چاند، البیلی صبح، تاجدار صبح، آبشار نغمہ، برسات کی چاندنی وہ زندہ جاوید نظمیں ہیں جن کے سبب جوش

شاعرِ فطرت ہی نہیں پیغمبرِ فطرت کہلائے۔''4؎

فطرت کے حسین مناظر پر کمال قدرت کے نتیجہ میں یہ شاعر فطرت سے موسوم ہوئے۔ نظمیں ان کی شناخت بنی لیکن ان کے کچھ گیت بھی ہیں جس میں نیچر، فطرت، قدرت کے مناظر اور ماحولیات کے اجزا کو بہت ہی خوبصورتی کے پیش کیا گیا ہے، ملاحظہ ہوں:

برسوں سے برس رہا ہے پانی　　جھم جھام، جھما، جھما، جھما جھم
برسوں سے برس رہا ہے پانی　　پھر بھی ہے میری زمین پیاسی
ہر باغ پہ چھائی ہے اداسی　　ہر گل کا ہے رنگ ارغوانی
برسوں سے برس رہا ہے پانی　　جھم جھام، جھما، جھما، جھما جھم

اس گیت میں پانی، گل، زمین اور باغ کا ذکر ہے۔ یہ سب کائنات کے حسین مناظر کی علامت کے ساتھ تمام مخلوقات کی ضروریات زندگیسے جڑی ہوئی ہیں۔ پانی پیداوار کی شکل میں کھانے پینے کی اشیا کے اُگانے، پھلوں کے پھلنے، پھولوں کے کھلنے، پیاس بجھانے، چیزوں کے نشوونما اور بقا کے لیے غیر مرئی طاقت رکھتا ہے۔ پھلوں اور پھولوں کے باغات قدرت کی تصویری جمالیات پیش کرنے کے علاوہ خوش گوار اور صحت بخش فضا فراہم کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ صحت کے ساتھ صحت بخش فضا بھی بے حد ضروری ہے۔ ان عناصر کو گیت کے چند مصرعوں میں پیش کرتے ہوئے تصویری جمالیات کی منظرکشی کی گئی ہے۔

آکاش پہ گار ہے ہیں بادل　　پُروائی کی بج رہی ہے چھاگل
ہر پتے میں پیت　　ہر جھونکا ایک گیت
ہر ندی مردنگ　　جنگل میں ہے رنگ
چل بھی مورے سنگ　　گوری چل بھی مورے سنگ
نگری میری کب تک یونہی برباد رہے گی　　دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
آکاش پہ نکھرا ہوا سورج کا ہے مکھڑا　　اور دھرتی پہ اترے ہوئے چہروں کا ہی دکھڑا

کب ہوگا سویرا اے کاش بتادے کس وقت تک اے گھومتے آکاش بتادے
چہکار سے چڑیوں کا چمن گونج رہا ہے جھرنوں کی مدُھر راگ سے بَن گونج رہا ہے
اے چاند میری امیدوں کو شمع دکھادے ڈوبے ہوئے کھوئے ہوئے سورج کا پتہ دے
روتے ہوئے جگ بیت گیا اب تو ہنسادے اے میرے ہمالہ مجھے یہ بات بتادے

فلم ''من کی جیت'' 1944 میں جوش کا یہ گیت بہت مشہور ہوا۔ اس کے علاوہ اسی فلم میں ''پردیسی کیوں یاد آتا ہے'' ''من کا ہے گھبرائے'' ''مورے جبنا کا دیکھو'' یہ گیت بھی شامل ہے۔ اس میں آکاش، سورج، دھرتی، چڑیا، چمن، جھرنوں، ہمالہ وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس گیت میں اردو کے ساتھ ہندی کی ملاوٹ یعنی دونوں کی خوبصورتی کی علامت ہے اور جوش کی زبان پر قدرت کی دلیل ہے۔ یہاں بھی جن عناصر وعوامل کا ذکر ہے۔ خدا کی قدرت کا مظہر ہی ہے۔ ان چیزوں سے پوری کائنات بلاتفریق مذہب وملت، قبیلہ وگروہ، ذات، نسل اور تمام مخلوق فائدہ اٹھارہی ہیں۔ آسمان اپنے آنچل میں بادلوں، چاند، ستاروں، سیّاروں اور نہ جانے کتنی ہی ایسی بے شمار چیزوں کو لیے ہوئے ہے اور جہاں کہیں جس قدر ضرورت پڑتی ہے، وہاں اپنا آنچل کھول کر نعمتیں بکھیر دیتا ہے۔ سورج اپنی کرنوں سے پکانے سکھانے، اُگانے اور مخصوص مقدار میں مخلوق کے جسم میں توانائی بخشنے کے ساتھ بہت ساری نقصان دہ چیزوں سے بھی بچاتا ہے۔ غیبی طاقت کے تحت اپنے مشن میں لگا ہوا ہے۔ تاریخ، دن، مہینہ اور سال کا اندازہ اسی کے گردش پر ہوتا ہے۔ دھرتی اپنی کوکھ سے مختلف طرح کی پیداوار اور دفینے کو باہر نکالتی ہے۔ اس کے سینے کو چیر کر خزانے دریافت کیے جاتے ہیں۔ چشمے، تالاب، ندی، کنویں، لوہے، پیتل، تانبے، پٹرول، گیسیز، کھانے کی اشیا اور بے شمار چیزیں ہیں جس تک ہماری رسائی بھی نہیں لیکن اس کی کوکھ میں محفوظ ہیں۔ یہ سب ہمارے ہی لیے ہے۔ جو کرشمہ قدرت کے علاوہ خوش گوار آب وہوا کی فراہمی کے لئے مددگار ہوتی ہیں اور قدرت کی تصویری جمالیات ان کے گیتوں میں نظر آتے ہیں۔ بیابانوں، اور پہاڑوں کی پیشانی

سے نکلنے او رگرنے والا آبشار اپنے آپ میں گیت گاتا ہوا پورے بیاباں کو گیت سناتا ہے۔اس سے وہاں موجودہ تمام مخلوق کی پیاس بجھانے، پیڑ پودے کی سیرابی کرنے اور جنگل کی خوبصورتی کے ساتھ دیکھنے والے کو اندورنی خوشی ملتی ہے۔ یہ سب کچھ دھرتی کے آس پاس پھیلی زیریلی گیس کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے نفع بخش آب وہوا کی فراہمی میں اہم کردار کرتے ہیں۔اس سے اچھی فضا، اچھا ماحولیاتی اسباب کی فروانی میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا اور اس کے علاوہ گیتوں کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ جوش شاعر فطرت ہی نہیں پیغمبر فطرت بھی تھے۔نظموں کے علاوہ گیتوں میں بھی، جمالیاتی تصویر اور فطرت کی عکاسی خوب نظر آتی ہے۔ادبی دنیا، سماج اور ملک میں اپنے کلام سے ہلچل مچانے والا قادرالکلام شخص جن کی تاریخ وفات جناب نصیر ترابی نے جوش کے ایک مصرع سے نکالی ہے جو حیرت انگیز ہے۔ ''میں شاعر آخرالزماں ہوں اے جوش5ؔ

جوشؔ 12، فروری 1982، کو پاکستان میں انتقال ہوئے۔مجموعی طور پر جب آپ جوش کی پوری شاعری کا مطالعہ کریں گے تو آپ بھی اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ جوش کے گیتوں میں تصویری جمالیات کی ایک نئی دنیا آباد ہے، ایک ایسی دنیا جو صرف اور صرف ہمیں اردو شاعری میں ان کے یہاں ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

ماآخذ:

(1) تاریخ ادب اردو، پروفیسر نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1977، ص:189/188 (2) جوش ملیح آبادی تنقیدی جائزہ، خلیق انجم، ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔1992، ص:92 (3) تاریخ ادب اردو، پروفیسر نورالحسن نقوی، ایجوکشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1977، ص: 188 (4) تاریخ ادب اردو، پروفیسر نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1977، ص: 189/188) ہمارے جوش صاحب، خورشید علی خاں، ذیشان کتاب گھر، جنوری 1946، ص:586

☆☆☆

Community Participation in Education : In the Context of NEP 2020 by Md. Shabbir (Research Scholar) Prof. Ashwani(Prof.) dept. of Education & Training, MANUU, Hyderabad, cell-

محمد شبیر (ریسرچ اسکالر) پروفیسر اشونی (پروفیسر) شعبہء تعلیم وتربیت، مانو، حیدرآباد)

قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں: تعلیم میں کمیونٹی اشتراک

تمہید: تعلیم کا فرد اور ملک کی ہمہ گیر ترقی سے گہرا تعلق ہے۔ یہ نہ صرف ہمیں ایک صحت مند ماحول تیار کرنے میں مدد کرتا ہے بلکہ یہ ایک اعلی درجے کی کمیونٹی بھی پیدا کرتا ہے۔ تعلیم میں معاشرے کی شمولیت یہ کوئی نیا تصور نہیں ہے زمانہ قدیم میں جو بھی تعلیمی ادارے ہندوستان میں تھے جیسے گروکل، آشرم اور مدارس ان سب کی دیکھ ریکھ اور انتظام وانصرام مقامی معاشرے کے زیر اثر تھے۔ ان اداروں کی جو بھی ضرورت ہوا کرتی تھی وہ سب معاشرہ ہی پورا کرتا تھا چاہے وہ مالی امداد ہو یا پھر زمینی یا ان کی دیکھ ریکھ۔

بیسویں صدی سے قبل زیادہ تر رسمی تعلیم نجی افراد یا مذہبی اداروں کے ذریعے فراہم کی جاتی تھی اور مذہبی ادارے پورے کے پورے معاشرے کے دارومدار رہتی تھی۔ لیکن جب برطانوی سرکار کی ہندوستان میں آمد ہوئی تو ادارے معاشرے سے ہٹ کر ریاست میں منتقل ہو گئے اور ریاست کے ذریعے ان اداروں کی دیکھ ریک اور امداد ہونے لگا۔ انیسویں صدی میں حکومت نے تعلیم اور تعلیمی ادارے کی ذمہ داری لی جو بیسویں صدی کے وسط تک اپنے عروج پر تھی۔ حکومت نے تعلیم اپنے ذمے لینے سے اسکول اور معاشرے کے درمیان فاصلے بڑھنے لگے اور معاشرہ اسکول کو سرکاری محکمہ سمجھنے لگی اور اس وقت یہ عقیدہ کمزور ہو گیا کہ اسکول ہمارا اپنا ہے۔ لیکن جب ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا اور ہندوستان میں تعلیم اور تعلیمی ادارے کی ترقی سے

متعلق سوچا اور غور وفکر کیا تو انہوں نے کہا کہ پائیدار ترقی اور امن کے حصول کے لیے تعلیمی ترقیاتی پالیسی کی تشکیل، نفاذ اور نگرانی میں معاشرے کی شرکت اور متحرک ہونا بے حد ضروری ہے اور اس کے بعد ہندوستان کی جتنی بھی تعلیمی کمیشن اور کمیٹی آئی ان سب نے معاشرے کو تعلیم اور تعلیمی ادارے سے جوڑنے کی بات کی اور ابھی جو قومی تعلیمی پالیسی 2020 آئی ہے اس نے بھی معاشرے کو آنگن باڑی سے لے کر اعلی تعلیم تک شمولیت کی بات کی ہے۔

کمیونٹی شراکت کا تصور: کموونٹی کے معنی ہے لوگوں کے ایک گروہ جو تہذیب وثقافت اور رہن سہن مس ن ایک جسیی ہوں ان کو کموینٹی کہا جاتا ہے اور کموینٹی شراکت کا مطلب ہے انہی گروہ کے ذریعے کسی خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لے ایک ساتھ مل کر کام کرنا تا کہ وہ مقصد ہو جائے اور کموانٹی سے فائدہ اٹھائیں ص اسی کو کموونٹی کا شرکت کہتے ہیں۔

تعلیم میں کمیونٹی شراکت کا مطلب ہے کہ تعلیم کے میدان میں کمیونٹی کے لوگوں کا جسمانی اور مالی طور پر مدد کرنا تعلیم کے میدان میں بہت سارے ایسے مسائل آتے ہیں جو صرف اساتذہ اس کو حل نہیں کر سکتے لیکن جب وہ کمیونٹی کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں تو وہ مسائل آسانی سے حل ہو جاتا ہے اور تعلیم کا جو مقصد ہوتا ہے وہ بھی پورا ہو جاتا ہے اور اس طرح تعلیم معیاری ہو جاتی ہے۔ یونسکو کے مطابق " تعلیم میں کمیونٹی اشتراک ایک ایسا عمل ہے جس میں معاشرہ کے ارکان کو تعلیم کے مسائل پر فیصلہ سازی اور کاروائی میں شامل کیا جاتا ہے۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے مطابق " تعلیم میں کمیونٹی شراکت سے مراد اسکول کی منصوبہ بندی انتظام میں والدین، کمیونٹی رہنما اور کمیونٹی کے دیگر تنظیموں کا شامل کرنا ہے "

ہندوستان میں کمیونٹی شراکت سے متعلق تعلیمی پالیسی کا جائزہ:

ہندوستان کی آزادی کے بعد ہندوستانی تعلیم کے لیے مختلف کمیٹی، کمیشن اور پالیسی آئی ہیں اور لگ بھگ ان سب نے معاشرے کو تعلیم سے جوڑنے کی بات کی ہے ذیل میں چند کمیشن، کمیٹی اور پالیسی بیان کیا جا رہا ہے۔کوٹھاری کمیشن (66-1964) نے

اسکول کی تعلیم میں کمیونٹی کی شرکت کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ اسکول میں معیاری تعلیم کو فروغ دینے کے لیے مقامی معاشرے اور اسکول کے درمیان قربت قائم کرنا ضروری ہے اس نہیہ بھی سفارش کی کہ تمام سطحوں پر تعلیم کو غیر مرکزیت کیا جائے۔

قومی تعلیمی پالیسی (1986) نے تعلیم کے عمل میں کمیونٹی کو شامل کرنے اور پرائیمری تعلیم کی منصوبہ بندی اور انتظام کو غیر مرکزیت کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ نیشنل کریکولم فریم ورک (2005) نے تعلیم کو معیاری بنانے کے لیے معاشرہ کی شرکت کی حوصلہ افزائی کی کہ اگر معاشرہ اسکولی تعلیم سے جڑا رہے گا تو تعلیم معیاری ہوسکتی ہے۔ حق تعلیم قانون (2009) نے اسکولی تعلیم میں کمیونٹی کی شرکت کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ ہر اسکول میں والدین اور مقامی لوگوں پر مشتمل ایک ایس ایم سی (SMC) اسکول مینجمنٹ کمیٹی ہو۔ جو اسکول کی دیکھ بھال کرے اور گرانٹس کی نگرانی کرے اور اسکول کے طریقے منصوبہ کی تیاری کے لیے ذمہ دار ہو۔ قومی تعلیمی پالیسی (2020) نے اس بات پر زور دیا کہ آنگن باڑی سے لے کر اعلی تعلیم تک معاشرے کو شرکت کی جائے اور تمام تدریسی تحقیقی اور خدماتی سرگرمیوں میں معاشرے کی شمولیت کو مرکز میں لایا جائے۔

کمیونٹی اور تعلیم کا رشتہ: معاشرہ اور تعلیم ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہے معاشرہ ہے تو تعلیم ممکن ہے۔ قدیم زمانے میں تعلیم کا پورا دارومدار سماج پر ہی تھا سماج ہی اسکول کی دیکھ ریکھ کرتا یہاں تک کہ اسکول کی زمین اور استاد کا تنخواہ بھی سماج کے ذمہ ہی تھا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد بہت ساری تعلیمی پالیسی آئی اور کمیشن آے ان سب نے بھی سماج کو تعلیم سے جوڑنے کی بات کی کیونکہ سماج جب اسکول سے جڑا رہے گا تو اسکول کی نگرانی اور معیاری تعلیم کے لیے جو بھی ضروریات ہوں گی و؟ اسکول کے اندر مہیہ کرائے گا چاہے ذاتی طور پر ہو یا پھر سرکار سے مطالعہ کر کے ان ضروریات کو پورا کرگا۔ تعلیم معاشرہ کی رسم ورواج اور ثقافت کی حفاظت کرتا ہے اور آنے والی نسلوں تک اس کی منتقلی بھی کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی ترقی بھی کرتے ہیں تعلیم معاشرہ کی ضروریات

کو مدنظر رکھ کر اس کے نصاب تیار کئے جاتے ہیں اور معاشرہ کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے کہ جس سے اس کی ضروریات پوری ہو سکے اور سماج ترقی یافتہ ہو سکے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور کمیونٹی شراکت: قومی تعلیمی پالیسی 2020 تعلیم کے میدان میں ایک جامع تصور پیش کرتی ہے ایک ایسا تعلیمی نظام جو ہندوستانی اخلاقیت سے جڑا ہوا ہے جو سب کو اعلی معیاری تعلیم فراہم کر کے ہندوستان کو ایک مساوی اور متحرک علمی معاشرہ میں تبدیل کرنے میں براہ راست تعاون کرے گا۔ قومی تعلیمی پالیسی کا بنیادی اصول رسائی، مساوات، معیار، استطاعت اور احتساب پر مبنی ہے جس سے ہمارے ملک کے بچے اور نوجوان کو حال اور مستقبل کے متنوع قومی اور عالمی چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرے گا۔ قومی تعلیمی پالیسی نہ صرف ابتدائی تعلیم کے لیے بلکہ یہ ابتدائی سے لے کر اعلی تعلیم پر مبنی ہیں اس پالیسی نے ہر ایک شعبے کو پوری طرح سے تحقیق کی اور اپنا تجاویز پیش کی کہ کن شعبوں میں کیا ضرورت ہے اور کن شعبے میں کیا تبدیلی کرنی ہے تا کہ ہمارا جو تعلیمی نظام ہے وہ بہتر اور معیاری ہو سکے۔ قومی تعلیمی پالیسی نے مرکزی اور ریاستی سرکار کے ساتھ معاشرے کی تنظیموں این جی اوز (NGOs) اور غیر سرکاری تنظیموں سے تعاون کرنے کی بات کی ہے۔ اگر سماج اور معاشرہ کے لوگ اسکول اور کالج کی دیکھ ریکھ کرینگے تو تعلیم بہتر اور معیاری ہوگی اور اسکول کے مختلف مسئلے انتظامی، بنیادی سہولیات امعیاری تعلیم کا ہو اسکول اور سماج سرکار کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں معاشرے کو تعلیم میں جوڑنے کی بات کی ہے جس سے اسکول میں ایک مثبت ماحول تیار ہوگا اور تعلیم معیاری ہوگی۔ کیونکہ طلبہ کی شخصیت اور صلاحیت کو نکھارنے میں سماج اور تعلیم کا کردار اہم ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں تعلیم میں کمیونٹی اشتراک سے متعلق تجاویز اور سفارشات:

☆ ابتدائی بچپن دیکھ بھال اور تعلیم (ECCE) کے آفاقی رسائی کے لیے والدین کو آنگن باڑی کے تمام پروگرام میں شامل کیا جائے گا۔

☆ابتدائی بچپن دیکھ بھال اور تعلیم (ECCE) کہ آفاقی رسائی کے لیے NCERT اور SCERT کے ذریعہ ایک ماڈل تیار کیا جائے گا اور اس ماڈل میں والدین کو بھی شامل کیا جائے گا تا کہ وہ اپنا تعاون دے سکے۔

☆ بنیادی خواندگی اور شماریات مشن کو آگے بڑھانے کے لیے معاشرہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کا تعاون لیا جائے گا۔

☆جب بچے ناقص خوراک یا غیر صحتمند ہوتے ہیں تو وہ بہتر طریقے سے سیکھنے سے قاصر ہوتے ہیں لہذا بچوں کی غذائیت اور صحت سے بھرپور خوراک پر توجہ دی جائے گی اور اچھی تربیت یافتہ سماجی کارکنان، مشیران اور اسکول کے تعلیمی نظام میں معاشرے کو بھی شامل کیا جائے گا۔

☆تربیت یافتہ سماجی کارکن اور اساتذہ طلبہ اور والدین کے ساتھ منسلک رہیں گے اور اسکول میں پڑھنے والے بچے کی حاضری اور اکتساب کو جانچ کریں گے۔

☆اسکول میں انفراسٹرکچر اور طلبہ کی شراکت قائم ہوجانے اور معیاری تعلیم کو یقینی بنائے رکھنے کے لیے مقامی زبان کے اساتذہ کا تقرری کیا جائے گا۔اساتذہ والدین کے ساتھ بات چیت کرتے رہیں گے تا کہ والدین اور معاشرہ کی شراکت مسلسل بنی رہے۔

☆ بچوں کی اکتساب میں سدھار کے لیے سابقہطلبہ اور معاشرہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کو شامل کیا جائے گا تا کہ وہ اپنا ذاتی تجربات سے بچوں کو روسناش کرے۔

☆ بچوں کے لیے ایک مجموعی ترقی کارڈ تیار کیا جائے گا اور اس سے اساتذہ اور والدین کو طلبہ کی ترقی کا پتہ چلے گا اساتذہ اور والدین دونوں مل کر طلبہ کی دیکھ ریکھ کریں گے۔

☆اساتذہ، والدین، پرنسپل اور دیگر اسسٹنٹ ملازمین ایک جامع کمیونٹی کا حصہ بنے جس کا مشترکہ مقصد اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ تمام بچے معیاری تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

☆اساتذہ، والدین اور دیگر اہم مقامی لوگوں کے ساتھ اسکولی انتظامیہ کمیٹی تشکیل کی

جائے گی۔

اسکولی کمپلکس، انتظامیہ کمیٹی اور اسکولی انتظامیہ کمیٹی اور ساتھ ہی ساتھ اسٹیک ہولڈر، سربراہان، اساتذہ، طلبہ، معاون عملہ، والدین اور متحرک گروپوں کے تعاون اور بہتر گورننس سے اسکولی تعلیمی نظام بہتر قائم ہوگا۔ایس ایم سی (SMC) اور ایس سی ایم سی (SCMC) اسکولوں کے کام کاج اور طرز عمل کی نگرانی کے لیے ایس ڈی پی (SDP) اور ایس سی ڈی پی (SCDP) کا استعمال کریں گے اور اسکیموں پر عمل درآمد میں تعاون کریں گے۔تعلیم بالغان کے لیے قومی ریاستی اور غیر سرکاری تنظیموں اور دیگر کمیونٹی تنظیموں کے ساتھ مل کر تعلیم بالغان کو فروغ کریں گے۔

مطالعہ سے موصول تجاویز: تعلیم میں سماج اور معاشرہ کا شامل ہونا یہ کوئی نیا تصور نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے ملک میں قدیم ہندوستان میں سماج ہی تعلیمی نظام کا دیکھ ریکھ کرتی تھی اور سماج کے تعاون سے ہی مدرسے اور گروکل وغیرہ چلتے تھے اور جب ہندوستان انگریزوں سے آزاد ہوا اس وقت سے اب تک جتنے بھی کمیشن اور کمیٹی آئی ہے ان سب نے معاشرہ کو تعلیم اور اسکول سے جوڑنے کی بات کی ہے تاکہ تعلیم کو غیر مرکزیت بنا کر سماج سے جوڑا جائے۔اسکول اور معاشرے کی ربط سے والدین اپنے بچوں کی معیاری تعلیم کے لیے بہتر نظام بنا سکتے ہیں۔جس سے سماج اور بچوں کی ضروریات کو پورا کرنے کا ایک مثبت ماحول تیار ہوگا۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے بھی پرزور طریقے سے سفارش کی ہے کہ معاشرہ کو آنگن باڑی سے لے کر اعلی تعلیم تک میں شامل کیے جائے اس سے اسکول کا ماحول گھرانہ محسوس ہوگا اور بچے پوری دلچسپی اور محنت کے ساتھ اسکول میں اپنا حاضری بنائے رکھیں گے اور ساتھ ہی ساتھ بچے اپنی تعلیم جاری رکھیں گے۔قومی تعلیمی پالیسی نے یہ بھی کہا ہے کہ اسکول کی جو انتظامیہ کمیٹی بنے گی اس میں والدین، اساتذہ اور تعلیم یافتہ مقامی لوگوں کو اس کمیٹی میں شامل کیا جائے گا۔تاکہ SMC اور SDMC کمیٹی اپنی تعاون سے اسکول کو ایک مناسب ماحول فراہم کرے گی جس سے بہتر گورننس سے

تعلیمی نظام چلے گا۔

آج کی اس دور میں صرف سرکار تمام تعلیمی نظام کو دیکھ ریک نہیں کر سکتی ہے۔ بڑھتی ابادی کو دیکھتے ہوئے سبھی تک تعلیم اور تعلیمی بیداری پہنچانا مشکل ہوتا ہے اس لیے قومی تعلیم پالیسی نے معاشرہ کو تعلیم سے جوڑنے کی بات کی ہے۔ سماج تعلیم سے جڑے گا جس سے سرکار کو تعلیمی نظام میں مدد ملیگی۔ معاشرہ کی تعلیمی نظام میں شرکت سے زمینی تہہتک تعلیمی مسئلوں کا حل کر کے سبھی کو تعلیم یافتہ بنایا جا سکتا ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے اہم مقاصد میں معیاری تعلیم سبھی تک پہنچانا ہے۔ سماج اور تعلیم کے ربط سے معیاری تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے۔ سرکار کے مختلف تعلیمی پروگرام، پالیسی کی بیداری بھی سبھی تک پہنچ سکتی ہے۔ سبھوں کی تعلیم اور شمولیاتی تعلیم کے مقاصد کو ہم تعلیم میں معاشرے کی شرکت کے بغیر حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔

حوالہ:

1. وزارت تعلیم، کوٹھاری کمیشن (66-1964) نہیں دہلی بھارت سرکار۔
2. وزارت تعلیم، قومی تعلیمی پالیسی (1986) نئی دہلی بھارت سرکار۔
3. این سی ای ارٹی، نیشنل کریکولم فریم ورک (2005) نئی دہلی بھارت سرکار۔
4. وزارت قانون اور انصاف، حق تعلیم قانون (2009) نئی دہلی بھارت سرکار۔
5. وزارت انسانی وسائل ترقی، قومی تعلیمی پالیسی (2020) نئی دہلی بھارت سرکار۔
6. اشونی (2016) شکچھا میں سمودائک سہبھاگتا۔
7. ڈبلوڈبلوڈبلو. یونسکو. کمیونٹی پارٹی سپیسن ان ایجوکیشن۔

☆☆☆

Tarannum Reyaz ka Novelet "Mera Rakht-e-Safar Aansoo" Ek Jaeza by Mubashshera Layiq (research Scholar, dept. of Urdu Lucknow University Lucknow) cell-8534879765

مبشرہ لیق (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ)

ترنم ریاض کا ناولٹ "مرارختِ سفر آنسو" ایک جائزہ

خطۂ کشمیر سے تعلق رکھنے والی ادیبہ ترنم ریاض اردو ادب کی دنیا میں غیر معمولی اہمیت کی حامل نظر آتی ہیں۔ انہوں نے فکشن نگاری کے میدان میں خصوصاً جموں کشمیر کی خواتین فکشن نگاروں میں ایک منفرد شناخت قائم کی ہے۔ شاید ہی کوئی فنکار ہو جو ان کے نام سے نہ واقفیت رکھتا ہو۔ ترنم ریاض نے افسانہ نگاری، ناول نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری، ترجمہ نگاری اور تنقید و تحقیق کے میدان میں بھی اپنی بھرپور صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ ترنم ریاض نے جہاں ان تمام اصناف ادب میں اپنا مقام بنایا وہیں ان کی ناولٹ نگاری کے بہترین نمونے بھی ان کے ناولٹوں کے مجموعے "فریبِ خطۂ گُل" (چار ناویلا) کی صورت میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ مجموعہ "فریبِ خطۂ گُل" 2009ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں چار ناولٹ شامل ہیں اور انہیں میں سے ایک بہترین ناولٹ "مرارختِ سفر آنسو" بھی ہے، 57 صفحات پر مشتمل یہ ناولٹ ایک سچے واقعے پر مبنی ہے۔

ترنم ریاض نے سماجی، سیاسی، معاشرتی، کشمیری مسائل، بچوں، بزرگوں، عورتوں کی نفسیات اور ان کے ساتھ ہونے والے استحصال وغیرہ کو اپنی تحریروں میں بطور موضوع پیش کیا ہے۔ ناولٹ "مرارختِ سفر آنسو" بھی ان میں سے ایک اہم موضوع کے تحت لکھا گیا ہے۔ اس میں مرکزی کردار روہنی کے ذریعہ ایک عورت کے احساسات و جذبات،

اس کی قربانیاں، اس کی ممتا، حوصلہ و جرأت مندی، ایثار نفسی، ازدواجی زندگی سے وابستہ مسائل کی ترجمانی کی ہے۔ اس ناولٹ میں پیش آنے والے حالات و واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنفہ نے ناولٹ کے آغاز میں ایک شعر رقم کیا ہے۔

شجر کو دیتی ہوں پانی وہ آگ اُگلتا ہے میں فصل خار کی چننے کو پھول بوتی ہوں 1

یہ ایک حقیقت ہے کہ مرد کے مقابلے میں عورتوں کے احساسات زیادہ نرم و نازک ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی عورت محبت ،وفا شعاری خلوص، صبر و استقلال جیسے جذبات سے پر ہوتی ہے۔ اور انہیں وجوہات کی بنا پر عورت اپنے حقوق کی آگاہی کے باوجود مرد کے ہاتھوں ہونے والے ظلم و جبر کو خاموشی سے برداشت کرنے میں ہی بھلائی سمجھتی ہے۔ کبھی اولاد کی محبت میں، تو کبھی اپنی جانب اٹھنے والے سوالوں کے ڈر سے، اور کبھی گھریلو سکون کو برقرار رکھنے کے لیے صبر کرتی جاتی ہے۔ جبکہ مرد کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے، وہ اپنی انا، اپنے نفس کے آگے کچھ اور سوچتا ہی نہیں، اور یہ چیزیں اس قدر اس پر حاوی ہو جاتی ہیں کہ انسان سے حیوان میں وہ کب تبدیل ہو جاتا ہے اسے خبر ہی نہیں ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایک مرد کا کردار اس ناولٹ میں روہنی کے شوہر چندر کانت ناگپال کی صورت میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ کہانی مرکزی کردار روہنی ناگپال کے ارد گرد گردش کرتی ہے۔ روہنی صبر و تحمل کے ساتھ زندگی کے ہر مشکل پڑاؤ کو پوری جرأت مندی سے پار کرتی ہے، وہ ممتا کے جذبات سے بھرپور، ایک مخلص بیوی ہونے کے باوجود اپنے شوہر کے ہاتھوں محض شک کی بنیاد پر بڑی بے رحمی سے قتل کر دی جاتی ہے۔ روہنی ایک مضبوط عورت ہوتی ہے جو معاشی حالات خراب ہونے پر افسردہ ہونے کے بجائے اپنے بچوں کے بہترین مستقبل کی فکر کرتے ہوئے، اس مشکل ترین وقت میں بھی، جب کہ اس کا شوہر اپنی غلط عادتوں کے سبب سب کچھ گواں چکا ہوتا ہے، اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر ایک نیا کاروبار شروع کرتی ہے۔ اور ایک عورت ہونے کے ناطے اپنی حدود کا خاص خیال رکھتے ہوئے، وہ ان تمام اشیاء کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اور

اپنے بچوں کی زندگی کو پرسکون بنانے کے لیے مسلسل جدوجہد میں لگی رہتی ہے۔ کیونکہ روہنی نہیں چاہتی تھی کہ جن محرومیوں سے اس کا گزر ہوا اس کی اولاد کسی بھی صورت میں ان حالات کا سامنا کرے۔ روہنی خود بغیر ماں کی بچی ہوتی ہے، اس کی پرورش اس کے والد اور دادی کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ روہنی بچپن سے ہی محبت اور توجہ کے لیے ترستی رہی ہے کیونکہ اس کے حصے کی توجہ اس کے پھوپھی زاد بھائی سنی کو ملتی ہے۔ وہ ہمیشہ روہنی اور اس کے والد کے درمیان موجود ہوتا ہے لیکن روہنی نے بھی کبھی کوئی شکوہ نہ کیا۔ روہنی کا بچپن گزرا اور جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس کی پھوپھی بضد رہیں کہ گریجویشن کے بعد روہنی کی شادی کر دی جائے، جبکہ روہنی تعلیم میں خاصہ دلچسپی رکھتی ہے۔ اور کسی طرح وہ اپنے والد صاحب کو راضی بھی کر لیتی ہے۔ وہ فیشن ڈیزائننگ کے تین سالہ کورس کے لیے انسٹیٹیوٹ میں داخلہ لے لیتی ہے۔ انسٹیٹیوٹ جاتے وقت ایک نوجوان بس اسٹاپ پر اسکولی بستہ لیے ایک بچے کے ساتھ کھڑا روہنی کو مسلسل گھورتا رہتا ہے۔ اس بات سے روہنی گھبرا جاتی ہے کیونکہ بمشکل اسے پڑھنے کی اجازت ملی تھی، اور ڈر تھا کہ کہیں اس کا گھر سے نکلنا نہ بند کر دیا جائے اور اسی بے بسی کے ساتھ وہ یہ معاملہ اپنی سہیلی رادھیکا کے درمیان رکھتی ہے۔ ناولٹ کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"گھر میں بتا دوں تو میرا باہر نکلنا بند ہو جائے گا، وہاں کسی کو سوائے حکم دینے کے میری کہاں پرواہ ہے جو میرے شوق کے لیے میرا ساتھ دیں۔۔ پڑھائی کا تو پھر سوال ہی نہیں۔ اور اگر انہیں نہ بتاؤں تو یہ آدمی میرا جینا مشکل کر دیگا۔" وہ بے بسی سے بولی"۔2

اس اقتباس کے ذریعہ واضح ہوتا ہے کہ ایک بغیر ماں کی بچی خود کو کس قدر بے بس اور لاچار محسوس کرتے ہوئے کس خوف کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ ناولٹ کا یہ کردار حقیقت سے کافی قریب نظر آتا ہے۔ کسی طرح وقت گزرتا ہے اور روہنی کی تعلیم بھی مکمل ہونے کو آتی ہے لیکن اس نوجوان کا رویہ جوں کا توں بنا رہتا ہے۔ ایک دن وہ اس کے نزدیک آ کر اس سے بات کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے خبر دیتا ہے کہ اس بچے

کی ماں نہیں رہی۔ روہنی کو یہ سن کر کافی افسوس ہوتا ہے جبکہ آج تک وہ اس شخص سے مخاطب بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ شخص ہی اس بچے کا باپ ہوتا ہے۔ اور وہ روہنی سے شادی کا مطالبہ بھی کر دیتا ہے۔ روہنی کچھ وقت غور وفکر کے بعد اس بچے کی خاطر اس شخص کے فیصلے پر حامی بھر دیتی ہے جبکہ دونوں کے گھر والے ان کے اس فیصلے پر رضامند نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کی رضامندی کو اولیت دیتے ہوئے شادی کر لیتے ہیں۔ یہ شخص کوئی اور نہیں چندر کانت ناگپال ہوتا ہے۔ مصنفہ نے اس بات کا خلاصہ کافی دیر سے کیا ہے تا کہ قاری کا تجسس برقرار رہے۔ یہ شادی کر کے روہنی ایک بچے کے بکھرتے وجود کو اپنے ممتا بھرے آنچل میں سمیٹ کر اس کے مستقبل کو محفوظ کر لیتی ہے۔

اس کہانی کے آخر میں مصنفہ نے قاری پر ایک اور چونکا دینے والا خلاصہ کیا ہے۔ چندر کانت کی پہلی شادی اس کی مرضی کے خلاف اس کے گھر والوں نے کاروباری مفاد کے لیے کر دی ہوتی ہے اور روہنی سے ملاقات کے بعد اس نے دوسری شادی کی خواہش ظاہر کی تو اس کی پہلی بیوی اس صدمے کی تاب نہ لا کر خودکشی کر لیتی ہے۔ روہنی سے شادی کے بعد اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے اور وہ اپنی بیوی کے ہمراہ الگ گھر میں رہنے لگتا ہے۔ وقت گزرتا ہے اور ان کے یہاں ایک بیٹی کی پیدائش ہوتی ہے، آہستہ آہستہ ان کی زندگی خوشگوار ہوتی چلی جاتی ہے تمام آسائشیں ان کے یہاں موجود ہوتی ہیں، پھر چندر کانت کو جوئے کی بری عادت ہو جاتی ہے اور اس میں اپنا سب کچھ ہار جانے کے سبب ان کے معاشی حالات خراب ہونے لگتے ہیں، اور چندر کانت اپنا سب کچھ گواں کر گھر میں بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن روہنی اپنے حوصلے کو پست ہونے نہیں دیتی ہے۔ اس مشکل وقت میں اسکا فیشن ڈیزائننگ کا کورس کافی حد تک مفید ثابت ہوتا ہے۔ ان دنوں مغربی طرز پر بنے خواتین کے لباس کی بڑھتی ہوئی مانگ کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے زیورات بیچ کر حاصل کردہ رقم سے زنانہ لباس کا شوروم کھولتی ہے۔ اور اس کاروبار میں وہ کامیابی کی منزلیں طے کرتے ہوئے خوب ترقی کرتی ہے، لیکن وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اور مزید

اپنے کاروبار کو بہتر طرز پر لانے کے لیے روہنی کو اپنی شخصیت میں بھی کافی کچھ تبدیلی لانا پڑتی ہے۔ کاروبار کے سلسلے میں لوگوں سے ملنا، مغربی پہناوے زیب تن کرنا وغیرہ۔ اسی درمیان روہنی کی ملاقات شوکمار شری واستو سے ہوتی ہے جو اس کا بزنس پارٹنر بن جاتا ہے۔ وہ روہنی کے لیے ایک مخلص دوست ثابت ہوتا ہے۔ جہاں ایک طرف روہنی اپنی بے جا محنت کے سبب یک بعد دیگرے ترقی کی سیڑیاں طے کرتی جا رہی تھی ادھر چندر کانت احساس کمتری میں مبتلا ہونے کے ساتھ ساتھ شک وشبہات میں ڈوبتا ہی چلا جا رہا تھا۔ نہ تو چندر کانت خود کام کی تلاش وفکر میں باہر نکلتا، اور نہ ہی روہنی کی کامیابی اسے گوارا ہوتی ہے اور غصہ میں آ کر ایک دن وہ اسے وگلر جیسے لفظ سے بلاتا ہے، جس سے روہنی کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ روہنی پر رعب دکھاتا ہے۔ روہنی کا دیر سے گھر آنا، بزنس ڈنر پر جانا، کبھی شوکمار کا اسے گھر چھوڑ دینا، چندر کانت کو برداشت نہیں ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"مجھے تمہاری بزنس ڈنرس میں کوئی دلچسپی نہیں سمجھیں؟"۔۔۔ مگر یاد رکھو اگر تم نے یہ طریقہ اپنایا تو میں یہ برداشت نہیں کروں گا۔۔۔" "تمہارا رات کو آنا مجھے بالکل پسند نہیں۔۔۔" کام نہیں کروں کیا۔۔۔، شوروم پر ہی دس بج جاتے ہیں۔۔، تمہارا مطلب ہے میں نکما ہوں۔۔۔" وہ بھنویں سکیڑے نتھنے پھلائے اس کے چہرے پر جیسے کہ حقارت سے نظریں جمائے رہا۔ میں نے کب کہا۔ مگر گھر کو تو چلنا چاہیے نا۔۔" "آج نہیں تو کل آپ کوئی نہ کوئی کام تو کرنے ہی والے ہیں۔ پھر نکما ہونے والی بات کیسے سوچ لی آپ نے۔۔ یہ تو ایک موڑ آ گیا ہے زندگی میں، ختم ہو جائے گا۔۔ آپ کچھ کرنا شروع ہی کر دیں۔۔ میں چھوڑ دوں گی۔۔ ایسا کیا ہے۔"3

اس اقتباس سے چندر کانت کی سوچ کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روہنی سے متعلق ہر چیز اس کے لیے انا کا مسئلہ بنتی ہی چلی جاتی ہے اور اپنی انا کے چلتے وہ روہنی پر بے جا پابندیاں تو عائد کر دیتا ہے، لیکن گھر دیر سے آنے یا لوگوں سے ملنے کی وجہ کو

مثبت طریقے سے جاننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوت نہیں رکھتا ہے۔قدرت نے روہنی کو غیر معمولی ذہانت سے نوازا ہوتا ہے اور یہی بات چندر کانت کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیتی ہے، وہ رفتہ رفتہ شراب کا عادی ہو جاتا ہے جس کے سبب روہنی کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔وہ اپنی ناکامی کا بدلہ روہنی سے لیتے ہوئے اس کی کامیابی اور ذہانت سے خنس رکھنے لگتا ہے۔لکین روہنی اپنے بچوں کی خاطر صبر و استقامت سے کام لیتے ہوئے، زندگی کو پرسکون بنانے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔ یہ معاملہ صرف ایک روہنی تک محدود نہ ہو کر پورے سماج کا المیہ بن چکا ہے کیونکہ نہ جانے کتنی ہی خواتین کبھی اولاد کی خاطر، تو کبھی سماج میں اپنی ساکھ قائم و دائم رکھنے کی غرض سے اسی طرح سختی برداشت کرتی ہیں۔ اور انہیں خواتین میں روہنی کا شمار ہوتا ہے۔ چندر کانت کی حرکتیں مزید بڑھتی چلی جاتی ہیں، جس سے اس کے بچے بھی پریشانی میں مبتلا رہنے لگتے ہیں۔کبھی خودکشی کی کوشش، کبھی روہنی کا گلا دبا کر اسے اذیت پہچانا، بار بار فون کر کے روہنی سے طرح طرح کے سوال کرنا کہ وہ کہاں ہے؟ اور کس کے ساتھ ہے؟ بلڈنگ کے گیٹ پر بیٹھے محافظ سے نظر رکھنے اور روہنی سے متعلق ہر لمحے کی خبر دینے کو کہنا یہ تمام باتیں بچوں کے لیے نہایت شرمندگی کا باعث بنتی جا رہی تھیں۔ اور ان سب سے تنگ آ کر روہنی کا بیٹا راہل ایک صبح چندر کانت کے کمرے میں جا کر اپنے باپ کو بہت باتیں سناتا ہے۔ ناولٹ کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"ڈیڈ اگر آپ ایسے ہی کرتے رہے تو ہمیں آپ کو مینٹل ہاسپٹل میں داخل کرنا پڑے گا۔۔۔۔۔ اگلی صبح راہل بیدار ہوتے ہی باپ کے کمرے میں داخل ہوا۔"اس طرح آپ سارے گھر کو بدنام کر رہے ہیں ڈیڈ۔۔۔ ماما ہم سب کے لیے کام کر رہی ہے۔۔آپ ان کے پیچھے ہی پڑ گئے۔۔ گھر میں خرچہ تک نہیں ہوتا تھا یاد ہے آپ کو۔۔۔ یہ سب مام کی وجہ سے ہے جو آپ شام ڈھلے ہی وودکا کی بوٹل لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔کون کرتا ہے یہ سب۔۔ مائی مام۔۔اوکے۔۔؟"4

کچھ دن سکون سے گزرتے ہیں، لیکن چندر کانت اپنی حرکتوں سے بعض نہیں آتا ہے۔ اور ایک رات چندر کانت ناگپال ہتھوڑے سے روہنی کے سر پر وار کر کے تیز دھار والے ہتھیار سے اس کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ اس قدر بے رحمی سے اس کی جان لے کر وہ اپنے اندر کی شدید نفرت و بے حسی کا مظاہرہ کرتا ہے اور وہ خود بھی ریل کی پٹری پر لیٹ کر خودکشی کر لیتا ہے۔ جس یتیمی سے روہنی کا گزر ہوا تھا وہی یتیمی روہنی کے بچوں کا مقدر بن جاتی ہے۔ جس بچے کی خاطر اس نے چندر کانت سے شادی کی ہوتی ہے اس بچے کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لیے ممتا بھرا آنچل چھوٹ جاتا ہے۔ اس کہانی کا انجام قاری کے لیے ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ آخر روہنی کی غلطی کیا تھی؟ وہ اپنے شوہر کے کام خراب ہونے کے بعد دل برداشتہ نہ ہو کر، اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے، خود منزل کی تلاش میں نکلتی ہے۔ اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو جاتی ہے، تو کیا اس کا گھر سے نکلنا غلط تھا، یا پھر کامیاب ہونا، یا اس کے مضبوط ارادے غلط تھے۔ چندر کانت کے پاس سے ایک پرچہ بھی برآمد ہوتا ہے جس میں اس نے اپنی خودکشی کا اعتراف کرتے ہوئے پورے معاملے کا قصوروار شوکمار شری واستو کو ٹھہرایا ہوتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کس قدر شک کے دلدل میں پھنس چکا تھا جہاں سے نکلنے کے لیے اسے سوائے موت کے کوئی دوسرا راستہ نظر ہی نہ آیا۔ کہانی کا اختتام قاری کو اس قدر جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے کہ وہ جذبات و احساسات کے دریا میں بہتا ہی چلا جاتا ہے، کہ کس طرح مرد کی انا اور اس کے دل میں اپنی بیوی کی طرف سے پیدا ہونے والے شک و شبہات، شادی جیسے خوبصورت رشتے اور ان سے جڑی نہ جانے کتنی زندگیوں کو ویران کر دیتے ہیں۔

مصنفہ نے اس ناولٹ کو "مرا رخت سفر آنسو" عنوان بھی کچھ سوچ کر ہی دیا ہوگا کہ کس طرح روہنی کی زندگی بچپن سے لے کر آخر وقت تک ایک امتحان بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کی زندگی کے پورے سفر میں اسے سوائے آنسوؤں کے کچھ ہاتھ نہیں آتا ہے، نہ جانے کتنے ہی مشکل مراحل کو اس نے اکیلے ہی طے کیا ہوتا ہے پھر بھی اس کا انجام اس قدر

ہولناک ہوتا ہے۔ یہ کہانی صرف ایک روہنی کی نہیں، کتنی ہی عورتیں ہمارے سماج میں موجود ہیں جو تل تل مرنے پر مجبور ہیں اور اپنے شریک سفر یا گھر کے دیگر افراد کے ہاتھوں ہونے والے ظلم وستم کا شکار ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ترنم ریاض نے عورتوں کے حقوق کی بات کرتے ہوئے ان کے متعلق زیادہ لکھا لیکن انہیں اس بات سے ہرگز انکار نہیں کہ عورت اور مرد دونوں ہی قدرت کی بہترین تخلیق ہیں۔ وہ غیر جانبداری سے کام لیتے ہوئے دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کی بات کرتی ہیں۔ ترنم ریاض نے اس ناولٹ کے ذریعہ مرکزی کردار روہنی کے احساسات وجذبات اور اس کے تمام مسائل کو قاری کے روبرو پیش کیا ہے کیونکہ ایک خاتون ہونے کے ناطے مصنفہ ایک عورت کے معاملات کو بخوبی سمجھ سکتی تھیں۔ اور انہوں نے عورت سے جڑے مسائل کو عوام کے سامنے پیش کر کے بخوبی اپنے فرائض کو ادا کیا ہے۔ ترنم ریاض نے جہاں ایک طرف مرکزی کردار روہنی کو ایک مضبوط اور حساسیت سے بھرپور عورت کے کردار کے طور پر پیش کیا ہے، تو وہیں دوسری طرف چندر کانت کے کردار کے ذریعہ ایسے مرد کی عکاسی کی ہے جو صرف عورت پر حکمرانی کرنا جانتا ہے، وہ رشتوں کا پاس ولحاظ بھول کر اقتدار کی چاہ میں روہنی کا قتل ہی کر دیتا ہے۔ اور اس طرح ایک مرد کی انا رشتوں کے درمیان آ کر محبتوں کو جدا کر دیتی ہے۔ اور بچوں سے ان کے والدین دور ہو جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ناولٹ میں شوکمار، روہنی کے بچے راہل اور منی، جگنو، روہنی کے والد، اس کی دادی، پھوپھی، ان کا بیٹا سنی، چندر کانت کی پہلی بیوی شکنتلا، روہنی کے گھر کے ملازمین وغیرہ کے کردار بھی کہانی کو مضبوطی عطا کرتے ہوئے اسے آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس ناولٹ کا مطالعہ کرتے وقت قاری کا تجسس آغاز سے لے کر کہانی کے اختتام پذیر ہونے تک برقرار رہتا ہے۔

ناولٹ کا پلاٹ سادہ اور مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ منظر نگاری، کردار نگاری، زبان و بیان وغیرہ سبھی اعتبار سے یہ ایک بہترین ناولٹ ہے۔ مصنفہ نے کرداروں کے اعتبار

سے ہی زبان کا استعمال کیا ہے، جہاں انہوں نے پڑھے لکھے طبقے کو دکھایا ہے وہاں اسی کے مطابق زبان کی ادائیگی بھی کرتی نظر آتی ہیں۔ اس ضمن میں اقتباس ملاحظہ ہو:

"سوچ لیجیے میم! ایسا آفر مشکل سے ملتا ہے۔" اس نے جیسے کہ سرگوشی میں کہا۔ "ہماری سلم اینڈ اسمارٹ' ماڈلز، آپ کے اس ٹریڈ مارک کے ساتھ سچ مچ کی مرمیڈ نظر آئیں گی۔ چلتی پھرتی جل پریاں۔ آپ ہماری بات کرائیے نا 'اونر' کے ساتھ۔" "آپ بیٹھیے۔" لڑکی نے ایک طرف رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "میں جگنو کو بلاتی ہوں۔ وہی دیکھتی ہے یہ سب۔" اس نے دوسری طرف کے کاونٹر کے قریب ایک لڑکے کو کچھ اشارہ کیا جو کسی گاہک کو 'پل اوورز' دکھا رہا تھا۔ جگنو اس کاروبار میں ماہر تھی۔ ہنستی مسکراتی کہیں سے آن پہنچی۔ ہیے۔۔ مائی سیلف جگنو۔۔۔" وہ ہونٹ بھینچ کر مسکرائی۔ "او ہیلو آئی ایم شوکمار شریواستو۔ لوونگلی کالڈ شوشری۔۔۔ یعنی آپ مجھے شوشری بلاسکتی ہیں۔"5

اس اقتباس کے ذریعہ پڑھے لکھے طبقے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مصنفہ نے ناولٹ میں فلیش بیک تکنیک اور بیانیہ تکنیک سے خوب کام لیا ہے، ساتھ ہی فنی لوازمات کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ ناولٹ تحریر کیا ہے۔ مصنفہ نے ناولٹ میں لفاظی سے گریز کرتے ہوئے عام سادہ سی نثر میں اپنے خیالات کو بذریعہ قلم قاری کے روبرو پیش کیا ہے۔ اس طرح ترنم ریاض کا یہ ناولٹ "مرارخت سفر آنسو" بلاشبہ بہترین ناولٹوں میں شمار کیے جانے کے قابل نظر آتا ہے۔

حواشی:

1 ناولٹ: مرارخت سفر آنسو، مشمولہ فریب خطۂ گل، صفحہ 96

2۔ ایضاً، صفحہ 118۔117 3 - ایضاً، صفحہ 130

4۔ ایضاً، صفحہ 137۔136 5۔ ایضاً، صفحہ 103

☆☆☆

Islam, Qanoon-e-Hind aur School : Ek Hamajehat Tajziyati Mutala (Islami Talimi Tasawwarat aur Bhartiya Dastoor ke Tanazur mein ek Ilmi-o-Tahqiqi Dastavez by Hafiz Md. Anwar Mustafa(Secondary teacher (Urdu BPSC)UMV Kabirchak, Darbhanga)cell-8279714276

حافظ محمد انوار مصطفیٰ (سیکنڈری ٹیچر (اردو بی پی ایس سی) یو ایم وی کبیر چک، دربھنگہ

اسلام، قانونِ ہند اور اسکول: ایک ہمہ جہت تجزیاتی مطالعہ

(اسلامی تعلیمی تصورات اور بھارتی دستور کے تناظر میں ایک علمی و تحقیقی دستاویز)

.1 تمہید: کثیر مذہبی معاشرہ اور دستوری توازن ۔ ہندوستان اپنی قدیم تاریخ اور کثیر المذہبی معاشرت کے باعث دنیا میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے جس کا دستور (Constitution) "سیکولرازم" یعنی لادینیت کے عظیم الشان اصول پر مبنی ہے۔ یہاں سیکولرازم کا مطلب مذہب دشمنی نہیں، بلکہ ریاست کا تمام مذاہب کے ساتھ یکساں رویہ اور غیر جانبداری ہے۔

ریاست کا اپنا کوئی سرکاری مذہب نہیں ہے، بلکہ دستور کی رو سے ریاست تمام مذاہب کا یکساں احترام کرنے اور انہیں پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کرنے کی پابند ہے۔ اسلام، جو کہ آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کا دوسرا بڑا مذہب ہے، اپنے پیروکاروں کو علم کے حصول کی نہ صرف ترغیب دیتا ہے بلکہ اسے ایک مقدس فریضہ قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانونِ ہند اور اسلامی تعلیمات کا حسین سنگم خاص طور پر تعلیمی نظام اور اسکولوں کی شکل میں نمایاں نظر آتا ہے۔

.2 اسلام میں علم کی آفاقیت اور اہمیت ۔ اسلام کی عمارت ہی "علم" کی بنیاد پر استوار

ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کے لیے جو آخری کتاب نازل فرمائی،اس کا آغاز ہی لفظ" پڑھ" (اقراء) سے ہوا۔قرآنِ مجید کی پہلی وحی علم کی اہمیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

فرضیتِ علم: نبی کریم کا یہ فرمان کہ"طلبِ علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے" تعلیم کو ایک سماجی ضرورت کے بجائے ایک مذہبی ذمہ داری بنا دیتا ہے۔

جامعیت: اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم کی تقسیم محض" دینی" اور" دنیاوی" خانوں میں نہیں کی جا سکتی۔عصری علوم جیسے سائنس، ریاضی، تاریخ اور فلسفہ کا حصول بھی ایک مومن کے لیے عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔

تسخیرِ کائنات: علم کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کائنات کے حقائق کو سمجھے، خالق کی معرفت حاصل کرے اور مخلوقِ خدا کی خدمت کر سکے۔ اسلام کے نظامِ تعلیم میں ذرہ برابر بھی اس بات کی گنجائش نہیں کہ علم کو کسی مخصوص دائرے میں قید کر دیا جائے۔

.3 بھارتی آئین: اقلیتوں کے لیے تعلیمی و ثقافتی تحفظ ۔ بھارتی دستور کے معماروں، بالخصوص ڈاکٹر امبیڈکر اور مولانا ابوالکلام آزاد، نے ملک کی مذہبی ولسانی رنگارنگی کو برقرار رکھنے کے لیے چند ایسی دفعات شامل کی ہیں جو مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے لیے تعلیمی ڈھال کا کام کرتی ہیں۔

الف: دفعہ 29 (ثقافتی حقوق کا تحفظ)۔ یہ دفعہ ہندوستان کے کسی بھی حصے میں رہنے والے شہریوں کے اس طبقے کو، جس کی اپنی مخصوص زبان، رسم الخط (Script) یا ثقافت ہو، اسے محفوظ رکھنے کا مکمل حق دیتی ہے۔ یہ اردو زبان اور اسلامی طرزِ معاشرت کے تحفظ کے لیے ایک بنیادی قانونی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

ب: دفعہ 30 (تعلیمی اداروں کے قیام کا حق)۔ یہ بھارتی دستور کی سب سے طاقتور دفعہ ہے جو تمام مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو درج ذیل حقوق عطا کرتی ہے:

قیام و انتظام: اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے (اسکول، کالج، یونیورسٹیاں) قائم

کرنے اور ان کا انتظام سنبھالنے کا مکمل اختیار ہے۔

حکومتی امداد: حکومت تعلیمی اداروں کو مالی امداد (Grant-in-aid) دیتے وقت اس بنیاد پر تفریق نہیں کرے گی کہ وہ ادارہ کسی اقلیتی طبقے کے زیرِ انتظام ہے۔

.4 اسکولوں کی درجہ بندی اور مذہبی تعلیم کا قانونی موقف۔ بھارتی قانون کے تحت تعلیمی اداروں میں مذہبی تعلیم کی فراہمی کے حوالے سے واضح حدود متعین کی گئی ہیں تاکہ ملک کا سیکولر ڈھانچہ متاثر نہ ہو۔

سرکاری اسکول (Government Schools): وہ ادارے جو مکمل طور پر سرکاری فنڈز سے چلتے ہیں، وہاں آئین کی دفعہ 28 کے تحت کسی بھی قسم کی خاص مذہبی تعلیم نہیں دی جاسکتی۔

اقلیتی اور نجی ادارے (Minority Institutions): وہ اسکول جو اقلیتوں نے قائم کیے ہیں یا جو مشترکہ طور پر چل رہے ہیں، وہاں قانونی طور پر اپنے مذہب کی تعلیم دینے کی اجازت ہے۔

رضامندی کی شرط: تاہم، قانون یہ کہتا ہے کہ کسی بھی طالب علم کو (یا نابالغ ہونے کی صورت میں اس کے والدین کو) اس کی مرضی کے خلاف کسی مذہبی تعلیم یا عبادت میں شرکت کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

.5 ہندوستانی مسلمانوں کا تعلیمی ماڈل: مدارس اور مشنری اسکول

ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی مذہبی شناخت اور جدید ترقی کے درمیان توازن پیدا کرنے کے لیے دو اہم راستے اختیار کیے ہیں۔

.1 مدارس کا نظام

مدارس بنیادی طور پر وہ خودمختار ادارے ہیں جہاں قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ قانونِ ہند کے تحت مدارس کو ایک خودمختار ادارے کی حیثیت حاصل ہے اور کئی ریاستوں میں "مدرسہ بورڈز" بھی قائم ہیں جو انہیں سرکاری نظام سے جوڑتے ہیں۔

.2 مسلم مشنری اور جدید اسکول ۔سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا شعور بیدار کیا۔اس کے نتیجے میں ہزاروں اسکول قائم ہوئے جہاں انگریزی، سائنس اور ریاضی جیسے عصری علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ساتھ ہی" دینیات" کا ایک لازمی پیپر شامل ہوتا ہے تاکہ بچہ اپنی جڑوں سے جڑا رہے۔یہ اسکول دفعہ 30 کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے قوم کی تعلیمی پسماندگی دور کررہے ہیں۔

.6 عصری چیلنجز: حجاب، نصاب اور عدالتی فیصلے۔حالیہ برسوں میں مسلم تعلیمی اداروں اور طلبہ کو چند نئے چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

حجاب کا معاملہ: اسکولوں میں یونیفارم اور مذہبی لباس (حجاب) کے درمیان قانونی بحث چھڑی ہوئی ہے کہ آیا یہ آئین کی دفعہ 25 (مذہبی آزادی) کے تحت آتا ہے یا اسکول کے نظم وضبط کے تحت۔

تعلیمی نصاب: قانونِ ہند اس بات پر زور دیتا ہے کہ نصاب" سیکولر" ہونا چاہیے اور اس میں کسی بھی مذہب کے خلاف نفرت انگیز مواد نہیں ہونا چاہیے۔

قومی نصاب (NCERT): مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ وہ قومی تعلیمی ڈھانچے میں رہتے ہوئے اپنی اسلامی اقدار اور تشخص کو کیسے محفوظ رکھیں۔

.7 سیکولر تعلیم اور اسلامی اقدار کا توازن

بھارتی دستور" سائنسی سوچ"(Scientific Temper) کو فروغ دینے کی بات کرتا ہے، جبکہ اسلام بھی عقل، تدبر اور مشاہدے کی دعوت دیتا ہے۔لہٰذا، ہندوستانی اسکولوں میں ایک ایسا ماحول فراہم کرنا ضروری ہے جہاں بچہ ایک اچھا شہری بننے کے ساتھ ساتھ اپنے ایمان پر بھی قائم رہ سکے۔

.8 خلاصہ واختتامیہ۔خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام اور قانونِ ہند کے درمیان تعلیمی میدان میں کوئی بنیادی ٹکراؤ یا تضاد نہیں ہے۔ بھارتی آئین مسلمانوں کو وہ تمام حقوق اور مکمل آزادی دیتا ہے جس کے ذریعے وہ ایسے تعلیمی مراکز قائم کرسکیں جہاں دنیاوی ترقی اور

اخلاقی و اسلامی تربیت کا حسین امتزاج موجود ہو۔

وقت کا تقاضا ہے کہ:

ان قانونی حقوق (دفعہ 29،30) کا بھرپور اور صحیح استعمال کیا جائے۔

اسکولوں کو جدید خطوط پر استوار کرتے ہوئے ملک کی ترقی میں حصہ لیا جائے۔

اسکولوں کو "تعلیم" کے مراکز بنایا جائے جہاں علم کے ذریعے انسان کی شخصیت سازی ہو۔ اسلام کا پیغامِ علم اور ہندوستان کا جمہوری دستور مل کر ایک ایسی نسل تیار کر سکتے ہیں جو روشن خیال بھی ہو اور با کردار بھی۔ کیس لاز (Case Laws) کی تفصیل درج ذیل ہے:

.9 اہم عدالتی فیصلے اور قانونی نظائر (Significant Case Laws)

بھارتی عدلیہ (Judiciary) نے وقت فوقت دستور کی دفعات 28، 29 اور 30 کی تشریح کرتے ہوئے اقلیتوں کے تعلیمی حقوق کو مستحکم کیا ہے۔ اس مضمون کی علمی ثقاہت کے لیے درج ذیل مقدمات کا حوالہ ناگزیر ہے:

الف: کیرالہ ایجوکیشن بل کیس (1958)

یہ ایک تاریخی مقدمہ ہے جس میں سپریم کورٹ نے واضح کیا کہ دفعہ 30 کے تحت اقلیتوں کو حاصل حق "مطلق" (Absolute) نہیں ہے، لیکن ریاست اس حق کو چھین نہیں سکتی۔ عدالت نے قرار دیا کہ حکومت معیارِ تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے ضوابط (Regulations) تو بنا سکتی ہے، لیکن ایسے قوانین نہیں بنا سکتی جو اقلیتی ادارے کے بنیادی کردار کو ہی ختم کر دیں۔

ب: ٹی ایم اے پائی فاؤنڈیشن بمقابلہ اسٹیٹ آف کرناٹک (2002) سپریم کورٹ کے 11 ججوں پر مشتمل بنچ نے یہ تاریخی فیصلہ سنایا۔ عدالت نے قرار دیا کہ اقلیتی اداروں کو اپنے یہاں اساتذہ کے تقرر اور طلبہ کے داخلے کا مکمل اختیار ہے۔ حکومت امداد (Grant) دینے کی بنیاد پر ان کے انتظام میں غیر ضروری مداخلت نہیں کر سکتی۔

ج: سینٹ اسٹیفن کالج بمقابلہ دہلی یونیورسٹی (1992)

اس کیس میں عدالت نے اقلیتی اداروں کو یہ حق دیا کہ وہ اپنے مخصوص مذہبی طبقے کے طلبہ کے لیے 50 فیصد تک نشستیں (Seats) مخصوص کر سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ میرٹ کو ملحوظ خاطر رکھیں۔

د: احمد آباد سینٹ زیویئر کالج بمقابلہ اسٹیٹ آف گجرات (1974)

عدالت نے اس فیصلے میں ایک بہت خوبصورت بات کہی: "سیکولرازم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام مذاہب کو مٹا دیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ تمام مذاہب کی مخصوص شناخت کو تحفظ دیا جائے"۔ اس فیصلے نے دفعہ 30 کو اقلیتوں کے لیے ایک "چارٹر آف رائٹس" بنا دیا۔

.10 تجاویز برائے مستقبل (Recommendations)

قانونی بیداری: مسلم تعلیمی اداروں کے منتظمین کو دستور کی دفعات اور سپریم کورٹ کے تازہ ترین فیصلوں سے باخبر رہنا چاہیے۔

معیار اور شناخت کا توازن: اسکولوں کو چاہیے کہ وہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنائیں تاکہ وہ قومی دھارے میں پیچھے نہ رہیں، لیکن ساتھ ہی اپنی اخلاقی اور مذہبی اقدار پر بھی سمجھوتہ نہ کریں۔

شفافیت: اقلیتی حقوق کا تحفظ اسی وقت ممکن ہے جب اداروں کا انتظام شفاف (Transparent) ہو اور وہ ملک کے تعلیمی قوانین کی پاسداری کریں۔

خلاصہِ مقالہ (Final Summary of the Article): یہ مضمون جس کا آغاز اسلام میں علم کی اہمیت سے ہوا اور دستوری دفعات سے گزرتا ہوا عدالتی فیصلوں تک پہنچا، اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان کا قانون مسلمانوں کو ترقی کے تمام مواقع فراہم کرتا ہے۔ اگر ہم دفعہ 30 کی روح کے مطابق معیاری اسکول قائم کریں، تو ہم ایسی نسل تیار کر سکتے ہیں جو قرآن کی حافظ بھی ہو اور وقت کی جدید ترین سائنس سے بھی لیس ہو۔

☆☆☆

Maulana Abdul Majid Dariyabadi : Urdu Adab aur Inshapardazi ka ek Munfarid Dabistan by Hafiz Md. Anwar Mustafa(Secondary teacher (Urdu BPSC)UMV Kabirchak, Darbhanga)cell-8279714276

حافظ محمد انوار مصطفیٰ (سیکنڈری ٹیچر (اردو بی پی ایس سی) یو ایم وی کبیر چک، دربھنگہ

مولانا عبدالماجد دریابادی: اردو ادب اور انشا پردازی کا ایک منفرد دبستان

(ایک جامع تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ)

1. تمہید:

ایک عہد ساز شخصیت کا ظہور: اردو ادب کی تاریخ مختلف ادوار سے گزری ہے اور ہر دور نے ایسے نبوغِ وقت پیدا کیے ہیں جنہوں نے زبان کی آب و تاب میں اضافہ کیا۔ لیکن بیسویں صدی کے افق پر مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام ایک ایسے آفتاب کی طرح ابھرا جس نے محض ایک سمت نہیں، بلکہ ادب، مذہب، فلسفہ اور سیاست کے ہر گوشے کو روشن کر دیا۔ 16 مارچ 1892 کو دریاباد (یو پی) کے ایک علم پرور خاندان میں پیدا ہونے والی یہ عظیم ہستی 1977 تک اردو ادب کی ایسی آبرو بنی رہی جس نے نثر کو ایک نیا ذائقہ 'اور آہنگ' عطا کیا۔ یہ دور تھا جب اردو نثر پرانی داستان گوئی اور مصنوعی عبارت آرائی سے نکل کر جدیدیت اور مقصدیت کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ مولانا نے زبان کو وہ سنجیدگی اور لطافت عطا کی جو اس سے پہلے نایاب تھی۔ ان کا مقصد 'ہمیشہ یہ رہا کہ زبان کو محض لفظوں کا کھیل نہ بنایا جائے بلکہ اسے فکر اور سچائی کا نقیب بنایا جائے۔

2. ابتدائی دور: فلسفیانہ ذہن اور تشکیلِ فکر:

مولانا کی ادبی زندگی کا آغاز خشک اور پیچیدہ فلسفیانہ موضوعات سے ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب وہ مغربی مفکرین مثلاً برکلے اور ہیوم سے نہایت متاثر تھے۔ **فلسفہ جذبات:** انہوں نے "Psychology of Emotions" پر کام کر

کے اردو میں ایک نیا علمی دروازہ کھولا۔ ان کی یہ کتاب آج بھی علم نفسیات میں ایک سند مانی جاتی ہے۔

اصطلاح سازی کا فن: مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے انگریزی کی پیچیدہ علمی اصطلاحات کا اردو میں ایسا متبادل تلاش کیا جو نہ صرف سہل تھا بلکہ اردو کے مذاق کے مطابق بھی تھا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ اردو محض شاعری کی زبان نہیں بلکہ یہ سخت علمی موضوعات کے لیے بھی موزوں ہے۔

.3 ماجدی اسلوب' کی جمالیات (Stylistic Excellence)

پروفیسر لیول کے امتحان یا رسالے میں "اسلوب" پر گہرائی سے لکھنا ضروری ہے۔ مولانا کا اسلوب اردو نثر میں سہلِ ممتنع' کی ایک مکمل مثال ہے۔

ایجاز و اختصار: مولانا طوالت کے سخت خلاف تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ بہترین گفتگو وہ ہے جو مختصر ہو مگر پُر اثر ہو۔ وہ بڑے سے بڑے واقعے یا خیال کو دو چار پُر زور جملوں میں قید کر لیتے تھے۔

مکالمہ اور خطابت: ان کی تحریر میں ایک عجب طرح کی روانی ہوتی ہے۔ پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مصنف آپ کے سامنے بیٹھ کر آپ ہی سے مخاطب ہے۔ ان کا ڈرامائی' انداز قاری کی توجہ کو بھٹکنے نہیں دیتا۔

نثری شاعری: انہوں نے نثر میں سجع' اور آہنگ' کا ایسا امتزاج پیدا کیا جو غالب اور آزاد کی یاد دلاتا ہے، مگر اس میں مولانا کا اپنا ایک منفرد ماجدی' رنگ ہے جو انہیں سب سے جدا کرتا ہے۔

.4 صحافت کا نیا معیار:

'صدق' اور صدقِ جدید': مولانا نے تقریباً آدھی صدی تک اپنے اخبارات کے ذریعے اردو دنیا کی فکری اور ادبی رہنمائی کی۔

طنز و مزاح کا شریفانہ انداز: مولانا کے طنز میں نشتر زنی نہیں بلکہ اصلاح کا پہلو نمایاں ہوتا

تھا۔ وہ کسی کی شخصیت پر حملہ کرنے کے بجائے اس کی برائی یا غلطی پر چوٹ کرتے تھے۔

زبان کی صحت کا پہرہ: مولانا اردو زبان کے محافظ' تھے۔ اگر کوئی بڑا ادیب بھی غلط املا یا غلط لفظ استعمال کرتا، تو مولانا صدق' کے ذریعے اس کی اصلاح کرتے۔ ان کا مشہور قول تھا: "زبان کی غلطی محض لفظ کی غلطی نہیں، بلکہ ذہن کی کجی کا ثبوت ہے۔"

.5 'آپ بیتی': اردو کی شاہکار خودنوشت: اگر مولانا کی صرف ایک کتاب" آپ بیتی" رہ جاتی، تب بھی وہ زندہ جاوید رہتے۔ بے باکی اور سچائی: اس کتاب میں انہوں نے اپنے ان دنوں کا بھی ذکر کیا جب وہ دہریت کا شکار ہو گئے تھے۔ اپنی غلطیوں اور ذہنی کشمکش کو جس شفافیت سے انہوں نے بیان کیا، اس کی مثال اردو سوانح نگاری میں نہیں ملتی۔

نفسیاتی تجزیہ: یہ کتاب محض حالاتِ زندگی نہیں بلکہ ایک انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

.6 سفر نامہ نگاری میں روحانی رنگ: مولانا نے جب حج کا سفر کیا، تو انہوں نے" سفر نامہ حجاز" لکھا۔ یہ پرانے سفر ناموں کی طرح محض راستہ اور مناظر کا بیان نہیں تھا۔

مشاہدہ حق: اس میں مولانا نے مقاماتِ مقدسہ کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں، ان کے رویوں اور اسلامی تاریخ کو ادبی چاشنی میں ڈھال کر پیش کیا۔ ان کا یہ سفر نامہ ایک عاشقِ رسول کے جذبات کی سچی داستان ہے۔

.7 تنقید اور لغت پر دسترس:

مولانا عبدالماجد دریابادی ایک سخت گیر اور ایماندار ناقد تھے۔

سہ لسانی عالم: انہیں اردو، عربی، اور انگریزی زبانوں پر برابر کا عبور حاصل تھا۔ انہوں نے مغربی تنقید کے اصولوں کو مشرقی ادب پر لاگو کیا مگر اپنی تہذیبی روایت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

تبصرہ نگاری: ان کے تبصرے اتنے معیاری ہوتے تھے کہ بڑے بڑے مصنف ان کے ایک جملے کی تعریف کے لیے ترستے تھے۔

.8 **معاصرین کے درمیان مرتبہ اور مقام، مولانا کا رابطہ اپنے دور کی ہر عظیم ہستیوں سے:**

علامہ اقبال: اقبال مولانا کے اسلوب کے اتنے مداح تھے کہ وہ انہیں اپنے لیے حق کا ترجمان' سمجھتے تھے۔

بابائے اردو (مولوی عبدالحق): انہوں نے مولانا کو اردو نثر کا ایک نیا ستون' قرار دیا۔

سید سلیمان ندوی: ان دونوں ہستیوں کے درمیان علمی خط و کتابت اردو ادب کا وہ قیمتی سرمایہ ہے جس سے تاریخ اور ادب کے نئے دروازے کھلتے ہیں۔

.9 **خطوط ماجدی، ایک مکالمہ:** مولانا کے خطوط ان کی انشا پردازی کا ایک منفرد پہلو ہیں۔ ان میں تکلف نہیں بلکہ سادگی اور خلوص ہے۔ وہ اپنے دوستوں کو خط لکھتے وقت بھی زبان کے معیار کو گرنے نہیں دیتے تھے۔ ان کے خطوط میں ان کی روزمرہ کی زندگی، ان کے دکھ اور ان کی شگفتہ مزاجی نمایاں ہے۔

.10 **خدمات کا مجموعی تجزیہ:** مولانا دریابادی نے اردو کو محض الفاظ نہیں دیے، بلکہ انہوں نے اردو کو ایک سنجیدہ فکر عطا کی۔ انہوں نے ثابت کیا کہ ادب محض حسن و عشق کی داستان نہیں بلکہ یہ انسانی زندگی اور آخرت کے سنوارنے کا ایک مقصد ہے۔ ان کی تحریروں میں جو ٹھہراؤ اور وضاحت ہے، وہ آج کے دور کے لکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

.11 **اختتامیہ (Conclusion):** الغرض، مولانا عبد الماجد دریابادی اردو ادب کے وہ سُومرتبہ ادیب ہیں جن پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ انہوں نے زبان کو سنوارنے، 'نتھارنے' اور اسے علمی وقار عطا کرنے میں جو کردار ادا کیا، وہ صدیوں تک یاد رکھا جائے گا۔ وہ ایک ایسے 'دبستان' کے بانی تھے جہاں عقل اور عشق، فلسفہ اور مذہب، اور قدیم و جدید کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کا سرمایہِ ادب آج بھی نئے تحقیق کاروں اور طلبہ کے لیے ایک سمندر ہے جس سے ہر کوئی اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ وہ" ادیبوں کے پروفیسر " تھے، تو یہ ان کے حق میں سب سے بڑی سچائی ہوگی۔

☆☆☆

Hakeem-ul-Ummat Allama Iqbal : Fikr-o-Fan ka Ek Hamagir Mutala
(Urdu Shairi aur Islami Fikr ke Tanazur mein ek Tahqiqi Maqala) by
Hafiz Md. Anwar Mustafa (Secondary teacher (Urdu BPSC)UMV
(Secondary Darbhanga)cell-8279714276

حافظ محمد انوار مصطفیٰ (سیکنڈری ٹیچر (اردو بی پی ایس سی) یو ایم وی کبیر چک، دربھنگہ

حکیم الامت علامہ اقبال: فکر وفن کا ایک ہمہ گیر مطالعہ

(اردو شاعری اور اسلامی فکر کے تناظر میں ایک تحقیقی مقالہ)

.1 تمہید: بیسویں صدی کا روشن مینار:

بیسویں صدی کے برصغیر میں جس شخصیت نے اپنی فکر سے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کیا اور اپنی شاعری سے اردو ادب کو عالمی وقار عطا کیا، وہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ہیں۔ علامہ اقبال محض ایک شاعر نہیں تھے، بلکہ وہ ایک عظیم مفکر، قانون دان، سیاست داں اور حکیم الامت تھے۔ انہوں نے اس وقت قلم تھاما جب امتِ مسلمہ زوال کا شکار تھی اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اقبال نے اپنی شاعری کو 'مقصدیت' کے سانچے میں ڈھال کر اردو ادب کو وہ جلال اور جمال عطا کیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

.2 اقبال کا ابتدائی دور اور فکری ارتقا:

اقبال کی شاعری کا آغاز روایتی رنگ میں ہوا، جس پر داغ دہلوی کی اصلاح کا رنگ نمایاں تھا۔ لیکن جلد ہی ان کی فکر میں وسعت پیدا ہوئی۔

وطنیت کا دور: ابتدا میں اقبال سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' جیسے نغموں کے ذریعے وطن پرستی کا پیغام دیتے نظر آئے۔

یورپ کا سفر: 1905 سے 1908 تک یورپ میں قیام نے اقبال کے فکری زاویوں کو

بدل دیا۔ انہوں نے مغرب کی مادی ترقی اور وہاں کے تہذیبی کھوکھلے پن کو قریب سے دیکھا، جس کے بعد ان کی شاعری میں آفاقیت' اور اسلامی عالمگیریت' کا رنگ غالب آ گیا۔

.3 فلسفۂ خودی: اقبال کے فکر کا محور:

اقبال کے پورے نظامِ فکر کی بنیاد" خودی" پر ہے۔ ان کے نزدیک خودی سے مراد غرور یا تکبر نہیں، بلکہ معرفتِ نفس' یا اپنی صلاحیتوں کا احساس ہے۔

خودی کی تربیت: اقبال کا ماننا تھا کہ جب انسان عشق، اطاعت اور ضبطِ نفس کے ذریعے اپنی خودی کو بلند کر لیتا ہے، تو وہ کائنات کی تسخیر کے قابل ہو جاتا ہے۔

پیغام: ان کا مشہور شعر خودی کی مکمل عکاسی کرتا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے < خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

.4 شاہین کا تصور: بلند پروازی کی علامت:

اقبال نے نوجوانوں کے لیے" شاہین" کی علامت تراشی۔ شاہین ان کے نزدیک ایک ایسا پرندہ ہے جو خوددار ہے، بلند پرواز ہے اور اپنا آشیانہ نہیں بناتا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلم نوجوان شاہین کی طرح پست خیالی کو چھوڑ کر ستاروں پر کمند ڈالیں اور اپنی دنیا آپ پیدا کریں۔

.5 اقبال اور عشقِ رسول:

اقبال کی شاعری کا خمیر عشقِ رسول سے اٹھا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی بقا اور ترقی کا واحد راستہ اتباعِ رسول میں ہے۔ ان کی نعتوں اور کلام میں جو تڑپ اور سوز پایا جاتا ہے، وہ ان کی بے پناہ عقیدت کا ثبوت ہے۔ ان کے نزدیک عقل' سے بڑا مقام عشق' کا ہے، کیونکہ عشق ہی وہ قوت ہے جو ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے۔

.6 کلامِ اقبال کے فنی محاسن:

ادبی نقطۂ نظر سے اقبال نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کو نئی اصطلاحات اور استعارات

سے نوازا۔

بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم: یہ مجموعے اردو شاعری کے وہ شاہکار ہیں جنہوں نے نظم اور غزل دونوں کے ڈھانچے کو بدل دیا۔

خطابت اور شکوہ: اقبال کی نظموں میں ایک خاص قسم کا جلال اور گھن گرج پائی جاتی ہے، جو قاری کے لہو کو گرما دیتی ہے۔ 'شکوہ' اور 'جوابِ شکوہ' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

.7 سیاسی خدمات اور تصورِ پاکستان:

اقبال صرف کتابوں کے شاعر نہیں تھے، بلکہ وہ ایک عملی سیاست داں بھی تھے۔ 1930 کے خطبہ الہ آباد میں انہوں نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ریاست کا جو خواب دیکھا، وہی بعد میں 'پاکستان' کی صورت میں شرمندہءِ تعبیر ہوا۔ انہوں نے قائداعظم محمد علی جناح کو خطوط لکھ کر ان کی سیاسی رہنمائی کی اور انہیں قوم کی قیادت کے لیے آمادہ کیا۔

.8 کلامِ اقبال کی آفاقیت (Global Reach):

اقبال کا پیغام صرف مسلمانوں یا برصغیر کے لیے نہیں تھا، بلکہ وہ پوری انسانیت کے لیے تھا۔ انہوں نے 'مردِ مومن' کا جو تصور پیش کیا، وہ ایک ایسے انسان کا ہے جو رنگ، نسل اور جغرافیائی حدود سے بالاتر ہو کر حق اور سچائی کا علمبردار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج اقبال کی شاعری کا ترجمہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

.9 اختتامیہ: اقبال کی عصری معنویت: آج کے پرفتن دور میں، جب نئی نسل اپنی شناخت کھو رہی ہے، کلامِ اقبال کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ان کی شاعری ہمیں مایوسی سے نکال کر امید کی کرن دکھاتی ہے۔ اقبال کا مقصد 'ایک ایسی قوم تیار کرنا تھا جو شاہین کی طرح بلند پرواز ہو اور جس کے دل میں عشقِ الٰہی کی تڑپ ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ علامہ اقبال اردو ادب کے وہ آفتاب ہیں جن کی شعاعیں رہتی دنیا تک فکر و شعور کی راہوں کو روشن کرتی رہیں گی۔

☆☆☆